وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے تحت، درجہ خامسہ میں داخل نصاب، حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کی اہم کتاب "الانتِباھاتُ المُفیدۃُ عن الِاشتِباھاتِ الجَدِیدَۃ" کا عام فہم انداز میں "خلاصہ و تسہیل" بہ عنوان

# آسان انتِباھاتِ مُفِیدَہ

تسہیل و تلخیص
عامر شعیب ڈیروی حفظہ اللہ
استاذ جامعہ فاروقیہ شجاع آباد

مکتبہ حنفیہ

# جملہ حقوق محفوظ ہیں


نام کتاب: الانتباهاتُ المفيدة عن الاشتِباهات الجديدة

نام مصنف: حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

نام تسہیل و تلخیص: آسان "انتباہاتِ مفیدہ"

کاوش و ترتیب: عامر شعیب ڈیروی حفظہ اللہ

استاذ جامعہ فاروقیہ شجاع آباد

کمپوزنگ: مولانا ابو محمد

ایڈیشن اوّل: محرم الحرام 1447ھ/ جولائی 2025ء

ملنے کا پتہ: جامعہ فاروقیہ پرانا ملتان روڈ شجاع آباد ضلع ملتان، پاکستان۔

رابطہ نمبرز: 03337734504......03077782175


نوٹ: فی الحال یہ کتاب باضابطہ مطبوع نہیں ہے۔ طباعت کی اجازت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

"محترم قارئین! کتاب کی تصحیح کی مکمل کوشش کی گئی ہے۔ تاہم انسان ہونے کے ناطے امکان خطا باقی ہے۔ اگر افہام و تفہیم میں سقم یا کوئی علمی غلطی نظر آئے، تو مطلع فرمائیں۔ قدردانی کے ساتھ غلطی کا تدارک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔" (از ملخص)

☆......☆......☆

# اجمالی فہرست

# تقریظ

شیخ التفسیر والحدیث، حضرت مولانا زبیر احمد صدیقی صاحب دامت برکاتہم العالیہ
مدیر جامعہ فاروقیہ شجاع آباد و ناظم وفاق المدارس العربیہ پاکستان، صوبہ پنجاب

برصغیر کے دینی مدارس و جامعات، اہلِ اسلام کے عقائد و اعمال کے محافظ، ان کی دینی ضروریات کی تکمیل کے علمبردار، اور امت کی فکری، علمی، معاشی، سیاسی رہنمائی کے مراکز ہیں۔ مدارس و جامعات کا نصابِ تعلیم، نظامِ تعلیم، اسی فکر کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدارس کو نہ تو کمرشل اصولوں پر چلایا جا رہا ہے اور نہ ہی یہ مدارس حصولِ معاش کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ مدارس کی تاسیس و بقاء محض اخلاص، خیرخواہی، خدمت اور اہلِ اسلام کی صحیح راہنمائی پر مبنی ہے۔ مدارس کے نصابِ تعلیم میں مرورِ زمانہ کے ساتھ عوامی تقاضوں کے مطابق کمی بیشی کی جاتی ہے۔

دورِ حاضر میں مغرب زدہ تجدد پسند اور عقل پرست عناصر کو مغربی قوتوں کی جانب سے، اسلام پر ہرزہ سرائی کرنے کے لیے نہ صرف تھپکی دی جا رہی ہے، بلکہ انہیں نظریاتی و فکری مدد فراہم کرنے کے علاوہ، مالی معاونت، تحفظ اور پروپیگنڈا کے لیے، ہر قسم کے وسائل بھی مہیا کیے جا رہے ہیں۔ ان کے اہداف میں اسلام کا نظریاتی ڈھانچہ، عقائد کی اساس اور دینی مسلّمات شامل ہیں۔ یہ رویہ کوئی نیا نہیں، بلکہ یہ وہی پرانا استعماری ہتھکنڈہ ہے، جو برصغیر میں پونے دو صدی قبل انگریز نے اپنایا۔

تب نئی نسل کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے لٹریچر، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ذہن سازی پر مبنی لیکچرز کو ذریعہ بنایا گیا۔ اور آج اس سازش میں سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا،

پرنٹ میڈیا اور این جی اوز بھی شامل ہو چکے ہیں۔

عقل پرست طبقے کے اسلام پر اس حملے کو روکنے کے لیے ہمارے حکیمُ الامت، مجددُ الملت، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ، جو کم و بیش ہزار کتب و رسائل کے مصنف ہیں، نے "الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ" کے نام سے ایک شاندار رسالہ تصنیف فرمایا۔ یہ رسالہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصابِ تعلیم میں شامل ہے، تاکہ طلبہ کو عقل پرست طبقے کے فکری حملوں سے، نہ صرف محفوظ رکھا جا سکے، بلکہ انہیں اسلام کے نظریاتی دفاع کے لیے بھی تیار کیا جا سکے۔

چونکہ یہ رسالہ قدیم اسلوب و زبان میں تحریر کیا گیا تھا، اس لیے عصرِ حاضر میں اس کی تفہیم عام طلبہ اور عوام کے لیے کسی قدر دشوار ہو گئی تھی۔ جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے، اس علمی سرمایہ کی عصری زبان و اسلوب میں ترجمانی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، تاکہ نئی نسل اس سے زیادہ مؤثر طور پر فائدہ اٹھا سکے۔

حق تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے عزیز اور جامعہ فاروقیہ شجاع آباد کے ممتاز استاذ، حضرت مولانا مفتی عامر شعیب ڈیروی زیدہ مجدہ کو، کہ انہوں نے اس رسالے کی نہ صرف تسہیل و تلخیص کی، بلکہ اسے دلچسپ اور عام فہم بنا دیا۔ مفتی صاحب اس سے قبل بھی درس نظامی کی متعدد کتب کی تسہیل و تلخیص کر کے دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

ان شاء اللہ! ان کی یہ کاوش بھی اہلِ علم، طلبہ، اور عوام الناس کے زبردست فائدے کا ذریعہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین!!

والسلام

(مولانا) زبیر احمد صدیقی

خادم جامعہ فاروقیہ شجاع آباد

# اظہارِ مسرت

استاذ العلماء، حضرت مولانا نعیم احمد صاحب دامت برکاتہم
استاذ الحدیث جامعہ خیر المدارس ملتان

بندہ نے ”الانتِباھاتُ المفیدۃ عن الاشتِباھات الجدیدۃ“ تصنیف حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تسہیل پر مشتمل آپ کی کتاب ”آسان انتباہاتِ مفیدہ“ کے چند صفحات، جن میں اصول موضوعہ بھی شامل تھے اور انتباہات بھی، مطالعہ کیے۔ یہ مطالعہ میرے لیے باعثِ مسرت ثابت ہوا۔

الحمدللہ! بندہ نے اسے سمجھنے اور سمجھانے کے اعتبار سے نہایت سہل پایا۔ طلبہ کے لیے پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوگیا، جبکہ اساتذہ کے لیے پڑھانا اور سمجھانا بھی بے حد سہل ہوگیا۔

اس سے قبل بہت سے اساتذہ ”الانتباہاتُ المفیدۃ“ کی تدریس میں دقت محسوس کرتے تھے اور بارہا اس بات کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ اسے حل کیا جائے اور اس کی تسہیل سامنے لائی جائے۔ لیکن جب میں نے آپ کی یہ تسہیل دیکھی تو اندازہ ہوا کہ اب مزید کسی تسہیل کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ آپ نے کافی وافی تسہیل کردی ہے۔ خصوصاً عنوان بندی اور تقطیع کے ذریعے جو وضاحت آپ نے کی ہے، وہ دراصل تسہیل کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ اس انداز نے کتاب کو نہ صرف سمجھنے، بلکہ ضبط کرنے اور یاد رکھنے کو بھی نہایت آسان بنادیا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے نہ صرف اساتذہ پر بلکہ بالخصوص طلبہ پر بھی بڑا احسان فرمایا ہے۔

والسلام
(مولانا) نعیم احمد
جامعہ خیر المدارس ملتان

# مختصر تذکرہ حکیم الامت، حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ

حکیم الامت، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ولادت باسعادت 5 ربیع الثانی، 1280ھ کو ہوئی۔ آپ کے والد گرامی کا اسم مبارک ”عبدالحق“ ہے۔ جبکہ آپ کا لقب ”حکیم الامت“ ہے۔ آپ کا ددھیالی خاندان ”فاروقی“ جبکہ ننھیالی خاندان ”علوی“ ہے۔

بچپن ہی سے ذکاوت وذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ آپؒ نے قرآنِ کریم کی سعادتِ حفظ حافظ حسین علیؒ سے حاصل کی۔ ابتدائی فارسی وعربی کی کتابیں اپنے وطن ہی میں حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھیں، جبکہ اس کے بعد کئی کتب اپنے ماموں واجد علی صاحبؒ سے پڑھیں، بعدازاں علوم دینیہ کی تکمیل کے لیے، 1295ھ کے آخر میں، دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور سن 1300ھ کو تقریباً بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فقیہ النفس، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دست مبارک سے آپ کی دستار بندی ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں سے مولانا یعقوب نانوتویؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی خصوصی توجہات آپ کو حاصل رہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مدرسہ فیض عام کانپور میں صدر مدرس مقرر ہوئے، پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور کی مسندِ صدارت کو اپنے علم وفضل سے مزین فرمایا۔ کانپور میں آپ کے درس حدیث کی شہرت ایسی پھیلی کہ دور دور سے طلبہ کشاں کشاں حاضر ہوتے۔

کانپور میں تدریس کے دوران، قطب العالم، حضرت شاہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے تزکیہ نفس کے لیے دست بہ دست بیعت ہونے کا شرف حاصل کیا، اپنے شیخ کے علوم ربانی وفیوض روحانی سے مستفیض ہوئے اور خلعت خلافت سے سرفراز ہوئے۔

چودہ برس تدریس کے بعد، 1315ھ میں تدریسی مصروفیات کو خیر باد کہہ کر ”خانقاہِ امدادیہ“ تھانہ بھون میں متوکلاً علی اللہ قیام فرمایا۔ پھر 47 برس تک اسی خانقاہ کو تبلیغ دین، تزکیہ نفس، اور تصنیف وتالیف کا مرکز بنائے رکھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف سمیت بیشتر علوم وفنون میں آپؒ کی عظیم الشان، گراں قدر اور بے نظیر خدمات ہیں۔

آپؒ کا علم نہایت وسیع وعمیق تھا۔ اس کا ثبوت آپ کی تصانیف کا ہر صفحہ دیتا ہے۔

دین کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس پر آپ کی تصنیف موجود نہیں۔ تصانیف کی کثرت وافادیت میں آپ کا جواب پورے ہندوستان میں کوئی نہ تھا۔ برصغیر کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے کم ہی گھر ہوں گے جہاں حضرت تھانویؒ کی کوئی کتاب موجود نہ ہو۔

تفسیر بیان القرآن آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اسی طرح حدیث میں "اعلاء السنن" کے ذریعے فقہ حنفی کی مستدل احادیث کا جو بڑا ذخیرہ جمع فرمایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی تصانیف ومواعظ سے لاکھوں افراد کو علمی وعملی فیض پہنچا۔

آپؒ شریعت وطریقت کا حسین امتزاج تھے۔ آپ بیک وقت عالم بے بدل بھی تھے، صوفی بھی۔ رومی عصر بھی تھے اور رازی وقت بھی۔ آپؒ نے طریقت باطنہ کو جس طرح افراط وتفریط کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپؒ کی بیعت وارشاد کا سلسلہ اتنا وسیع تھا کہ برصغیر ہی نہیں، بلکہ اس کے باہر بھی ہزاروں اشخاص نے آپ سے اصلاح وتربیت حاصل کی۔ اسی لیے آپ کو "حکیم الامت" کہا جاتا تھا۔ عوام وخواص، بڑے بڑے اہل علم وفضل اور اہل کمال کا جتنا بڑا طبقہ بیعت وارشاد کے ذریعے اس دور میں آپ سے مستفیض ہوا، وہ بے مثال ہے۔

آپ کی ذات علم، حکمت، معرفت اور طریقت کا ایسا سرچشمہ تھی کہ نصف صدی تک برصغیر کے مسلمان اس سے سیراب ہوتے رہے۔ آپ کی زندگی نہایت منظم تھی۔ ہر کام کا وقت مقرر تھا اور ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا۔ سینکڑوں خطوط موصول ہوتے مگر آپ ہر ایک کا جواب خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے۔ بلاشبہ آپ حکیم الامت اور مجدد ملت تھے۔ آپ نے ساری زندگی خدمت اسلام میں گزاری۔

16 رجب المرجب 1362ھ کی شب، بوقت عشاء 82 سال کی عمر میں، آپؒ نے تھانہ بھون میں اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ آپؒ کو خانقاہ امدادیہ سے متصل، حافظ ضامن شہیدؒ کے مزار کے قریب، خود آپ ہی کے وقف کردہ تاریخی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

☆......☆......☆

# "انتباہاتِ مفیدہ" لکھنے کا پس منظر

جس فن میں دینی عقائد کی بحث ہو اسے "علم کلام" کہا جاتا ہے۔اس فن کو صدیوں پہلے علمائے اسلام نے بہترین اصولوں کے ساتھ مدون کیا۔آج کل بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ چونکہ زمانہ بدل گیا ہے، لہٰذا ایک "نیا علمِ کلام" مرتب ہونا چاہیے۔مرورِ زمانہ کی وجہ سے بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مدون علمِ کلام کے اصولوں پر نظر کرتے ہوئے، یہ بات محلِ نظر ہے، کیونکہ علم کلام قدیم کے وہ اصول جو پہلے سے مدون ہیں کافی اور شافی ہیں۔ ہر دور میں پیدا ہونے والے اعتراضات کی انہی اصولوں کی روشنی میں تردید کی جا سکتی ہے۔البتہ اگر" نئے علمِ کلام" سے مراد یہ ہے کہ قدیم اصولوں کی روشنی میں آج کے شبہات کے ازالے کے لیے جدید طرزِ بیان اختیار کیا جائے، تو یہ بالکل درست بات ہے۔

ایک دوسرا باطل نظریہ یہ بھی بعض حلقوں میں پایا جاتا ہے، کہ اسلامی عقائد کو جدید نظریات اور سائنسی مفروضوں کے مطابق ڈھال دیا جائے، یہ سوچ نہ صرف غلط بلکہ خطرناک بھی ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کو محض عقلی اندازوں اور سائنسی تجربات کے تابع کر دیا جائے۔حالانکہ جو باتیں آج "تحقیقاتِ جدیدہ" کے نام سے مشہور کی جا رہی ہیں، ان میں سے اکثر یا تو سراسر مفروضے ہیں، یا پھر وہی پرانی گمراہ کن باتیں ہیں جو پہلے بھی کہی جا چکی ہیں اور جنہیں اسلامی متکلمین نے رد کر دیا تھا۔ہاں!

1) کچھ شبہات ایسے ہیں جو ماضی میں ختم ہو چکے تھے، مگر اب انہیں تازہ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

2) کچھ شبہات ایسے ہیں، جن کا نیا عنوان گھڑ لیا گیا ہے۔

3) جبکہ بعض اعتراضات کی بنیادیں واقعی نئی ہیں اور انہیں صحیح معنوں میں "تحقیقاتِ جدیدہ" کہا جا سکتا ہے۔

اسی بنا پر یہ کہنا کہ "علمِ کلام جدید کی تدوین ضروری ہے" کسی حد تک درست ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد نئے طرزِ بیان میں عقائدِ اسلام کا دفاع ہو، نہ کہ خود دین میں تبدیلی۔

اسی وجہ سے ایک عرصے سے میرے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ کسی طرح

موجودہ فکری اور اعتقادی اعتراضات کا ایک جامع اور مضبوط علمی جواب مرتب کیا جائے۔ اس کے لیے کئی منصوبے ذہن میں آئے، جن میں سے بعض جامع مگر بہت طویل تھے، اس لیے اس مختصر طریقے کو زیادہ موزوں پایا کہ جتنے شبہات اس وقت زبان زدِ عام یا کتب میں موجود ہیں، انہیں جمع کر کے جزئی جوابات دے دیے جائیں۔ اس طرح موجودہ شبہات کا ازالہ براہِ راست ممکن ہو سکے گا، اور ان کے ضمن میں جو کلی اصول حاصل ہوں گے، وہ آئندہ پیدا ہونے والے مشابہ شبہات کے لیے بھی ان شاء اللہ کافی ہوں گے۔

اسی خیال سے میں نے مختلف اصحاب سے شبہات جمع کرنے کی درخواست کی اور انتظار رہا کہ جب کافی مواد جمع ہو جائے گا تو اس کام کا آغاز کر کے تکمیل کی جائے گی۔

ابھی یہ انتظار جاری تھا کہ 1327ھ بمطابق 1909ء میں بنگال کے سفر کا اتفاق ہوا۔ راستے میں اپنے چھوٹے بھائی کے پاس علی گڑھ میں قیام کے دوران کالج کے بعض طلبہ نے ملاقات کی اور سیکرٹری صاحب جناب نواب وقارالامراء (درست نام وقارالملک ہے) تک خبر پہنچادی۔ ان کا رقعہ آیا اور اگلے روز خود تشریف لائے اور مجھے کالج لے گئے۔ چونکہ جمعہ کا دن تھا، وہاں ہی نماز ادا کی اور عصر تک طلبہ کی فرمائش پر کچھ بیان کیا۔

طلبہ کے اشتیاق اور ان کی علمی پیاس کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ جو شبہات پہلے سے معلوم ہیں، ان کے جوابات وعظ و نصیحت کے طور پر زبانی پیش کر دیے جائیں، اور پھر تحریری صورت میں بھی مختصر مگر جامع انداز میں شائع کیے جائیں، تاکہ غیر حاضرین بھی مستفید ہو سکیں۔ اگر درمیان میں مزید شبہات جمع ہو جائیں، تو انہیں بھی اس میں شامل کر لیا جائے اور اس کا دوسرا حصہ مرتب کر دیا جائے، ورنہ امید ہے کہ یہ ابتدائی رسالہ بھی قریب قریب کافی ہوگا۔

یہی وہ ابتدائی رسالہ ہے، جو اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ امید ہے کہ یہ کافی حد تک مفید ثابت ہوگا، اور "اگر کوئی صاحبِ علم اسے سبقاً سبقاً پڑھا کر سمجھائے، تو اس کا فائدہ اور بھی بڑھ جائے گا"۔ اگر اللہ کسی کو توفیق دے اور وہ جدید الحادی اور معترضانہ لٹریچر کو اکٹھا کر کے ان تمام اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ایک جامع کتاب مرتب کرے، تو وہ حقیقتاً "علمِ کلام جدید" کی بہترین مثال ہوگی۔

☆......☆......☆

# افتتاحی خطبہ

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں: "وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ"، اور ایسے شخص کا راستہ اپناؤ، جس نے مجھ سے لو لگا رکھی ہو۔ (لقمان:15)

اس آیت کریمہ میں ہمیں ہدایت دی گئی ہے کہ ہم نیک اور دین دار لوگوں کے راستے پر چلیں، لیکن آج کے دور میں علماء کرام کی باتیں اور نصیحتیں بہت سے لوگوں کے دل پر اثر نہیں کرتیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی چند بنیادی وجوہات اور کوتاہیاں ہیں:

## 1) شبہات (شک وسوالات) کو بیماری نہ سمجھنا:

دین کے متعلق بعض لوگوں کے دل میں مختلف قسم کے سوالات اور شبہات (جو کہ روحانی امراض ہیں) پیدا ہوتے ہیں، لیکن وہ انہیں کوئی مرض اور مسئلہ نہیں سمجھتے، اس لیے امراض جسمانیہ کی طرح ان کے حل کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

ایک عام بیماری کو ہی دیکھ لیجیے۔ اگر کسی کو کوئی جسمانی بیماری لاحق ہو تو وہ فوراً خود ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اگر ایک ڈاکٹر سے فائدہ نہ ہو تو دوسروں سے رجوع کرتا ہے، دوائیاں خریدتا ہے، اور مکمل علاج تک سکون سے نہیں بیٹھتا۔ لیکن جب دین کے معاملے میں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، تو لوگ خود علماء کے پاس جانے کے بجائے یہ توقع کرتے ہیں کہ علماء خود ان سے رابطہ کریں اور ان کے مسائل حل کریں، خود ان سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ اور اگر رجوع کرنے کے وقت ایک عالم کا جواب تسلی بخش نہ ہو تو کیا وجہ ہے کہ دوسرے علماء سے رجوع نہیں کیا جاتا؟ یہ کیسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کا جواب کسی سے نہیں بن پڑے گا؟ تحقیق کر کے تو دیکھنا چاہیے۔ بغیر تحقیق کیے یہ سوچ لینا کہ اس سوال کا کوئی جواب ہی نہیں، یا کوئی بھی عالم اس کا جواب نہیں دے سکتا، ایک بڑی کوتاہی ہے۔

## 2) اپنی عقل کو ہی حتمی سمجھنا:

بعض لوگ اپنی عقل وفہم اور رائے کو ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں، کسی اور کی بات ماننے اور سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے علماء کی طرف رجوع بھی نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک

کوتاہی ہے۔ کیونکہ اگر اپنے خیالات کی علماء سے تحقیق کی جائے، تو اپنی بہت ساری غلطیوں سے واقفیت اور ان کی اصلاح ہوگی۔

## 3) اتباع کی عادت نہ ہونا:

اتباع کی عادت کم ہے، اسی وجہ سے آج کل لوگ کسی بھی معاملے میں ماہرین کی بات ماننے کے بجائے خود ہی دلائل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ غیر ماہر کے لیے ماہرین کی بات ماننے اور ان کی تقلید کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔

مثال کے طور پر، اگر کسی کو جیومیٹری کے بنیادی اصول معلوم نہ ہوں، تو اسے جیومیٹری کی شکلیں اور حسابات سمجھانا بہت مشکل ہوگا۔ اسی طرح دین کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے بھی کچھ بنیادی علوم کی ضرورت ہوتی ہے، شرعی امور میں طالب بصیرت کے لیے ان امور سے جب تک واقفیت نہ ہو سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے جو لوگ ان علوم سے ناواقف ہیں، ان کے لیے خود تحقیق کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ علماء کی بات مانیں اور ان کی رہنمائی پر اعتماد کریں۔

## دینی شبہات دور کرنے کا دستور العمل:

اگر ہم چاہتے ہیں کہ علماء کی نصیحتیں ہمارے لیے مؤثر اور فائدہ مند ہوں تو ہمیں چاہیے کہ: دینی شبہات کو بیماری سمجھیں اور ان کے حل کے لیے خود علماء سے رجوع کریں، جیسے جسمانی بیماری کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، اسی طرح دینی مسائل کے لیے علماء سے مشورہ لینے کی عادت ڈالیں، اپنی رائے پر اعتماد کرنے کے بجائے، ان کی رائے پر اعتماد کریں، کیونکہ وہ دین کے ماہر ہیں۔ جو چیز سمجھ میں نہ آئے، اسے اپنی کمی سمجھیں اور دین کے ماہرین کی پیروی کریں۔ اگر آپ خود تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو پہلے بنیادی دینی علوم حاصل کریں، تا کہ آپ صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں۔

اگر ہم یہ طریقہ اپنائیں تو ان شاء اللہ دین پر مضبوطی سے عمل کر سکیں گے، اور علماء کی نصیحتیں ہمارے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں گی۔

# حکمت وفلسفہ کی تعریف اور اس کی اقسام

## حکمت کی تعریف:

حکمت کو فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔"یہ ایک ایسا علم ہے،جس کے ذریعے کائنات میں موجود اشیاء کے ان حقائق کو جانا جاتا ہے،جو واقع کے مطابق ہوں،اور اس سے انسان کو،کوئی قابل ذکر دینی یا دنیاوی کمال حاصل ہو"۔

گویا حکمت ایسا علم ہے جو انسان کو واقعات کے مطابق حقائق سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔شریعت سمیت جتنے علوم ہیں،سب میں چونکہ کسی نہ کسی حقیقت ہی کے احکام مذکور ہوتے ہیں،اس لحاظ سے کوئی علم بھی حکمت وفلسفہ کے اس عمومی مفہوم سے خارج نہیں۔

## حکمت کی اقسام:

ابتدائی طور پر حکمت کی دو قسمیں ہیں۔

(1)حکمت عملیہ (2)حکمت نظریہ

## حکمت عملیہ کی تعریف:

ایسی اشیاء کا علم جو حقیقت میں اپنا وجود رکھتی ہیں اور ان کو وجود میں لانا ہماری قدرت اور اختیار میں ہے۔جیسے نماز،روزہ،اچھے اور برے اعمال وغیرہ۔

حکمت عملیہ کا تعلق عمل سے ہے۔فقط علم برائے علم مقصود نہیں۔

## حکمت نظریہ کی تعریف:

ایسی اشیاء کا علم جو حقیقت میں اپنا وجود رکھتی ہیں اور ان کو وجود میں لانا ہماری قدرت اور اختیار سے باہر ہے۔جیسے:تمام حیوانات،نباتات،آسمان،سیارے وغیرہ،ان سب کا تعلق حکمت نظریہ سے ہے۔

حکمت نظریہ کا مقصد کائنات کی مختلف اشیاء کے حالات کو جاننا اور ان کے بارے

میں معلومات حاصل کرنے کی جستجو کرنا ہے، تاکہ ہماری معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

## حکمت عملیہ کی اقسام:

حکمت عملیہ کی تین قسمیں ہیں۔

### 1) تہذیب اخلاق:

یہ وہ حکمت عملی ہے جس میں ہر شخص کی ذاتی اور شخصی مصلحتوں کو جانا جاتا ہے۔

### 2) تدبیر منزل:

یہ وہ حکمت عملی ہے جس میں ان مصالح اور امور کو جانا جاتا ہے، جن کا تعلق ایک گھر میں بسنے والے افراد کی اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے جیسے: والدین کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق وغیرہ۔

### 3) سیاست مُدَنِیّہ:

یہ وہ حکمت عملی ہے جس میں ان مصالح اور امور کو جانا جاتا ہے، جن کا تعلق ایک شہر یا ملک کے باشندوں کی اجتماعی زندگی سنوارنے سے ہوتا ہے جیسے: رعایا کے حقوق، حکمرانوں کے فرائض وغیرہ۔

## حکمت نظریہ کی اقسام:

حکمت نظریہ کی بھی تین قسمیں ہیں۔

### 1) علم الٰہی:

یہ حکمت نظری کی وہ قسم ہے، جس میں ایسی اشیاء کے احوال کا علم حاصل کیا جاتا ہے، جو وجود خارجی اور ذہنی دونوں اعتبار سے مادے کی محتاج نہ ہوں۔

جیسے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا خارج میں وجود بغیر کسی مخصوص شکل کے ہے اور اس کا تصور بھی بلا مادہ، کسی مخصوص شکل کے بغیر ہے۔

## 2) علم طبعی:

یہ حکمت نظری کی وہ قسم ہے جس میں ایسی اشیاء کے احوال کا علم حاصل کیا جاتا ہے، جو وجود ذہنی اور وجود خارجی دونوں اعتبار سے مادے کی محتاج ہوں۔

جیسے: انسان خارج میں گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ ہے اور اگر اس کا ذہن میں تصور کیا جائے تب بھی وہ اسی حالت میں متشکل ہوتا ہے

## 3) علم ریاضی:

یہ حکمت نظری کی وہ قسم ہے، جس میں ایسی اشیاء کے احوال کا علم حاصل کیا جاتا ہے، جو وجود ذہنی میں تو کسی مخصوص مادے کی محتاج نہ ہوں، لیکن وجود خارجی میں مخصوص مادے کی محتاج ہوں۔

جیسے: کیلکولیٹر پر ظاہر ہونے والے اعداد کا ذہن میں کسی مخصوص مادے کے بغیر تصور کیا جاسکتا ہے، لیکن کیلکولیٹر کی اسکرین پر تب ہی نظر آئیں گے، جب کسی مخصوص شکل میں ہوں گے۔

## مقصد شریعت:

شریعت کا مقصد اصلی "خالق اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کو، اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے کی تعلیم ہے"۔ ان حقوق کی ادائیگی کے نتیجے میں جو دنیاوی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ احکامات شریعت میں سے اگر کوئی حکم بظاہر دنیاوی فوائد کے خلاف ہو اور اس سے کوئی فرد متاثر ہو رہا ہو، تو اس صورت میں دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی:

1) یا تو شریعت نے وہاں اکثریت کی مصلحت کو شخصی مصلحت پر ترجیح دی ہوگی، کیونکہ شریعت کو انفرادی فائدے کی وجہ سے معاشرے کا اجتماعی نقصان برداشت نہیں۔

2) یا پھر شریعت فرد کو ان روحانی نقصانات سے بچانے کی کوشش کرتی ہے، جو دنیاوی نقصان کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

## شریعت نے مقصودی طور پر کن علوم سے بحث کی ہے؟

حکمت کی چھ اقسام میں سے "علم ریاضی" اور "علم طبعی" کا خالق یا مخلوق کے حقوق کی ادائیگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے شریعت نے ان دو علوم سے بطور مقصود کوئی بحث نہیں کی

ہے۔اگرکہیں علم طبعی وغیرہ کا کوئی مسئلہ آیا بھی ہے تو علم الٰہی کے کسی مسئلہ کی دلیل یا مقدمے کے طور پر آیا ہے۔

البتہ شریعت نے جن علوم سے بحث کی ہے، ان میں سے ایک تو علم الٰہی ہے، جو مقاصد شریعت میں سے ہے، جس کی فروعات میں ”وحی، نبوت اور قیامت کے احوال کے مباحث“ شامل ہیں۔ان کو ”علم عقائد“ کا نام دیا جاتا ہے۔دوسری چیز جس سے شریعت نے بحث کی ہے، وہ ”حکمت عملیہ“ ہے۔جنہیں شریعت نے ”عبادات، معاشرت، معاملات اور اخلاقیات“ کا نام دیا ہے۔یہ چاروں اقسام حکمت کی مشہور قسموں تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ سے متصادم یا متفرق نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ علوم شرعیہ پانچ ہیں۔چار تو یہ اقسام ہیں:

(1) عبادات (2) معاملات (3) معاشرت (4) اخلاقیات (5) اور پانچویں قسم ”عقائد“ ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ان پانچوں اقسام سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ ان میں سے صرف ان علوم پر بات کرنی ہے، جن پر جدید تعلیم یافتہ طبقے کو شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ چونکہ یہ شبہات زیادہ تر عقائد سے متعلق ہیں، اس لیے ان تمام شبہات پر بحث سے اصل مقصد ”علم عقائد“ پر ہی گفتگو ہے۔اصل مقصود کی طرف آنے سے پہلے علم کلام کے مسائل میں کارآمد کچھ قواعد بیان کیے جاتے ہیں۔یہ قواعد ان مقاصد کے لیے ”اصول موضوعہ“ اور ”تسلیم شدہ نظری مقدمات“ کی نسبت رکھتے ہیں۔مقاصد کے بیان میں مختلف مقامات پر ان قواعد کا حوالہ دیا جائے گا، جن کو سمجھ کر پیش نظر رکھا جائے تو سابقہ شبہات ہی کا نہیں بلکہ آئندہ بھی جدید سے جدید تحقیقات سے پیدا ہونے والے شبہات کا بھی ان شاء اللہ قلع قمع ہوتا رہے گا۔

☆......☆......☆

# پہلا اصول

**متن:** کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا، اس کے باطل (وغلط) ہونے کی دلیل نہیں۔

**وضاحت:**

اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے، تو صرف اس بنیاد پر اسے غلط یا باطل نہیں کہہ سکتے کہ "ہماری سمجھ میں نہیں آرہی"، بلکہ کسی چیز کو باطل کہنے کے لیے واضح عقلی یا نقلی دلیل درکار ہوتی ہے۔ اس قاعدے کو سمجھنے کے لیے دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے:

**1) سمجھ میں نہ آنا:**

کسی چیز کا مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے، اس چیز کے اسباب یا کیفیات کا ذہن میں احاطہ نہ ہو، جس کی وجہ سے ذہن حیران ہو اور شئے سمجھ میں نہ آئے، لیکن اس کے انکار کی کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ ہو۔

**2) باطل ہونا:**

کسی چیز کے غلط ہونے پر کوئی مضبوط عقلی یا نقلی دلیل موجود ہو، جس کی بنا پر اس کا انکار کیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا مشاہدہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہ آنا اور کسی چیز کا باطل وغلط ہونا، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

**"سمجھ میں نہ آنے" کی حسی مثال:**

مثلاً: بیل گاڑی دیکھنے اور چلانے والا ایک دیہاتی، جس نے کبھی ریل گاڑی نہ دیکھی ہو، اس سے اگر یہ کہا جائے کہ ریل گاڑی بغیر کسی جانور کے کھینچنے کے خود بخود چلتی اور دوڑتی ہے، تو وہ حیران ہوکر کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا، لیکن وہ اس بات پر قادر نہیں کہ اس کے انکار پر کوئی دلیل پیش کرسکے، کیونکہ اس کے پاس خود اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جانور کے گھسیٹے بغیر کسی گاڑی کی مسلسل تیز رفتاری کا کوئی اور سبب نہیں ہوسکتا، اسے کہتے ہیں "سمجھ میں نہ آنا"۔

ظاہر ہے کہ اگر دیہاتی محض اتنی بنا پر ریل گاڑی کا انکار کرنے لگے یا ریل گاڑی کی بات کرنے والے کو جھٹلانے لگے، تو اسے بے وقوف ہی کہا جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہی ہوگی کہ

تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے ”شیٔ کی نفی“ کیسے لازم آئی؟

## ”کسی شیٔ کے باطل ہونے“ کی حسی مثال:

مثلاً: اگر کوئی شخص ”کراچی سے ریل گاڑی میں سوار ہوکر ملتان اترا، اور ایک شخص نے اس کے سامنے کہا کہ یہ ریل گاڑی کراچی سے ملتان تک ایک گھنٹے میں پہنچی ہے (جبکہ حقیقت میں کم از کم دس بارہ گھنٹے لگتے ہیں) تو وہ مسافر فوراً اس کو جھٹلائے گا، کیونکہ مسافر کے پاس، اس شخص کو جھٹلانے کی واضح دلیل ”خود اپنا مشاہدہ اور اس گاڑی میں سفر کرنے والے دیگر مسافروں کی گواہی“ موجود ہے۔

## ”سمجھ میں نہ آنے“ کی شرعی مثال:

اگر کوئی شخص یہ سنے کہ قیامت کے دن پل صراط پر چلنا ہوگا، جو کہ بال سے بھی زیادہ باریک ہے، تو چونکہ ایسی کوئی چیز دنیا میں دیکھی نہیں، تو حیران ہونا بجا ہے۔ لیکن اس کا انکار کرنا درست نہیں، کیونکہ اس کی نفی پر عقل کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ سرسری نظر میں اگر کوئی دلیل ہو سکتی ہے تو وہ یہ کہ قدم تو اتنا چوڑا اور قدم رکھنے کی چیز اتنی کم چوڑی، اس پر پاؤں کا ٹکنا اور چلنا ممکن نہیں، لیکن خود اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ پائیدان کی چوڑائی کا قدم سے زیادہ ہونا عقلاً ضروری ہے۔

یہ اور بات ہے کہ عادتاً ایسا ہی دیکھا ہو، اس کے خلاف نہ دیکھا ہو یا دیکھا تو ہو مگر اتنا زیادہ فرق نہ دیکھا ہو جیسے بعض لوگوں کو رسی پر چلتے دیکھا ہو۔ مگر اس میں کیا مشکل ہے کہ قیامت کے دن عادات وقوانین بدل دیے جائیں، بال جیسی باریک یا اس سے بھی زیادہ باریک چیز پر چلنا ممکن ہو جائے۔ لہٰذا! اگر کوئی شخص ”محض سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے“ پل صراط پر چلنے کا انکار کرے تو اس کی حالت ویسی ہوگی جیسے دیہاتی نے ”سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے“ ریل کے کسی جانور کے گھسیٹے بغیر چلنے کا انکار کیا تھا۔

## ”کسی شیٔ کے باطل ہونے“ کی شرعی مثال:

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ قیامت کے دن فلاں بزرگ کی اولاد اور رشتے دار، اگر چہ وہ مؤمن نہ بھی ہوں، بزرگ کی وجہ سے بخش دیے جائیں گے اور جنت میں جائیں گے۔ یہ بات عقلاً اگر چہ محال نہیں، مگر چونکہ اس کے خلاف قرآن وحدیث کی واضح نصوص موجود ہیں کہ مشرکین اور کفار کی بخشش نہیں ہوگی، اس لیے کسی بھی بزرگ کی کافر ومشرک اولاد اور رشتے داروں کی بخشش کی نفی کی جائے گی اور اس دعوے کو باطل کہا جائے گا۔ اور یہ باطل ہونا ایک مضبوط نقلی دلیل ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ

فَلَن يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ”موجود ہونے کی وجہ سے ہے۔

## دوسرا اصول

**متن:** جو امر عقلاً ممکن ہو اور دلیلِ نقلی صحیح اس کے وقوع (پذیر ہونے) کو بتلاتی ہو، اس کے وقوع (پذیر ہونے) کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر دلیلِ نقلی اس کے عدمِ وقوع (واقع نہ ہونے) کو بتلائے تو عدمِ وقوع (واقع نہ ہونے) کا قائل ہونا ضروری ہے۔

**وضاحت:**

اس اصول کو سمجھنے کے لیے درج ذیل تین اصطلاحات سے واقف ہونا ضروری ہے:

**1) واجب:**

وہ امور جن کا ہونا عقلاً ضروری ہو، انکار ممکن نہ ہو۔ مثلاً: ایک، دو کا آدھا ہوتا ہے۔

**2) محال:**

وہ امور جن کا ہونا عقلاً ممکن ہی نہ ہو، بلکہ عقلاً ان کا انکار ضروری ہو۔ مثلاً: ایک، دو کے برابر ہے۔

**3) ممکن:**

وہ امور جن کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں عقل خود کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرتی، بلکہ وہ دونوں امکانات ”ہونے، نہ ہونے“ کو جائز سمجھتی ہے۔ مثلاً: فلاں شہر (ملتان) کا رقبہ دوسرے فلاں شہر (لاہور) سے زیادہ ہے۔

عقل کے نزدیک دونوں صورتوں کے ممکن ہونے کی وجہ سے، یہ صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ اس کا حتمی فیصلہ کسی اور دلیل، جیسے تحقیق یا گواہی سے ہوگا۔

پس ایسے امور جو عقلاً ممکن ہوں، ان میں سے اگر کوئی امر قرآن وحدیث سے ثابت ہو تو اس کے ثابت اور واقع ہونے کا اعتقاد رکھنا واجب ہے۔ اگر قرآن وحدیث سے کسی ممکن

امر کا "نہ ہونا" ثابت ہو تو اس کے "واقع نہ ہونے" کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔

## محسوس مثال:

شہر کے رقبے والی مثال میں تحقیق کے بعد، کہیں اسے صحیح کہا جائے گا اور کہیں غلط۔

## منقول مثال:

عقل کے نزدیک جمہور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق "سات ٹھوس آسمانوں کا ہونا" ممکن ہے۔ یعنی "عقلاً" نہ تو ان آسمانوں کے "ہونے" کی کوئی قطعی دلیل موجود ہے، اور نہ ان کے "نہ ہونے" کی کوئی دلیل ہے۔ دونوں امکان ہیں۔ لہٰذا، اس بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کے لیے "نقلی دلیل" یعنی قرآن وحدیث، کو دیکھا جائے گا۔

قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ آسمان ایک خاص ترتیب اور نظام کے مطابق موجود ہیں، لہٰذا آسمانوں کے وجود پر ایمان رکھنا اور ان کے وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔

## اشکال:

جب عقل کے لحاظ سے آسمانوں کا "ہونا، نہ ہونا" دونوں ممکن ہیں اور ابھی ثابت کیا گیا ہے کہ "جس امر ممکن کی تائید دلیل نقلی سے ہو، اس کا قائل ہونا واجب ہے" اس تناظر میں ہم کہتے ہیں کہ یونانی فلسفی فیثاغورث (570-495 ق،م) سے بطور "دلیل نقلی" یہ تحقیق منقول ہے کہ آسمان موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا اس دلیل نقلی کی وجہ سے آسمانوں کا "قائل نہ ہونا" ضروری ہے۔

## جواب:

فیثاغورث کی تحقیق کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا۔ فیثاغورث کا آسمانوں کی نفی سے متعلق کوئی صریح قول ہے ہی نہیں۔ اُس کی تحقیق کا حاصل جو کچھ ہے، اس میں فی الواقع آسمانوں کا نہ اقرار ہے، نہ انکار۔ کیونکہ اس کے بقول: "نظام طلوع وغروب اور نظام کائنات کا چلنا آسمانوں کے وجود پر موقوف نہیں ہے یعنی کائنات کا نظام آسمانوں کے وجود کے بغیر بھی چل سکتا ہے"۔

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آسمان موجود ہی نہیں، صرف اتنا بتایا جا رہا ہے کہ نظام کائنات کا چلنا آسمانوں کے وجود پر موقوف نہیں، کسی چیز کا کسی چیز پر موقوف نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں۔ جیسے اگر شہر کا کوئی کام تحصیل دار، کمشنر وغیرہ پر موقوف نہ ہو تو اس سے یہ دلیل کس طرح لی جا سکتی ہے، کہ شہر میں کوئی تحصیل دار اور انتظامی عہدے دار موجود ہی نہیں۔

# تیسرا اصول

**متن:** محال عقلی (عقلی طور پر ناممکن) ہونا اور چیز ہے اور مستبعد (عجیب) ہونا اور چیز ہے۔ محال خلافِ عقل ہوتا ہے، اور مستبعد خلافِ عادت۔ عقل اور عادت کے احکام جدا جدا ہیں۔ دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ محال کبھی واقع نہیں ہوسکتا، مستبعد واقع ہوسکتا ہے۔ محال کو خلافِ عقل کہیں گے اور مستبعد کو غیر مدرَک بالعقل (جس کا ادراک عقل کے ذریعے نہ ہوسکے)۔ ان دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔

## وضاحت:

مندرجہ بالا اصول سمجھنے کے لیے درج ذیل اصطلاحات ذہن نشین کرلیں:

### 1) محال (ناممکن):

وہ امور جن کا ہونا عقلاً ممکن ہی نہ ہو، بلکہ عقلاً ان کا انکار ضروری ہو۔ اسے "ممتنع" بھی کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "ایک اور دو کا برابر ہونا"۔

### 2) مستبعد (ممکن مگر عجیب):

مستبعد وہ شئے جس کا ہونا عقل کے مطابق ممکن ہوتا ہے، لیکن چونکہ ہم نے اسے اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھا یا دیکھنے والوں سے بکثرت سنا نہیں ہوتا، اس لیے ہمیں فوری سمجھ آنے کے بجائے حیرانگی ہوتی ہے اور یقین کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

محال اور مستبعد میں بڑا فرق ہے، ان دونوں کو ایک سمجھ لینا بڑی غلطی ہے۔

## مستبعد اور محال کے احکام:

1) محال عقل کے خلاف، جبکہ مستبعد (عجیب) عادت کے خلاف ہوتا ہے۔

2) محال کبھی بھی واقع نہیں ہوسکتا، جبکہ مستبعد واقع ہوسکتا ہے۔

3) محال کا حکم: یہ عقلی طور پر ممکن ہی نہیں ہوتا، اس لیے محال کا محض محال ہونے کی وجہ

سے انکار ضروری ہے۔ مستبعد کا حکم: مستبعد کا انکار صرف اس بنیاد پر جائز نہیں کہ وہ عجیب ہے، یا سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ اگر عجیب ہونے کے علاوہ اس کے جھٹلانے کے دوسرے دلائل موجود ہوں تو پھر اسے جھٹلانا اور انکار کرنا لازم ہے۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہیے کہ اگر کسی ممکن چیز کے واقع ہونے پر صحیح دلیل موجود ہو، تو اس کا انکار کرنا غلط ہے، چاہے وہ کتنی ہی عجیب لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے واقعات کو غیر عجیب اور معمول کے مطابق سمجھا جاتا ہے، یہ سب عجیب ہی تھے، مگر بار بار دیکھنے، مانوس ہونے اور عادی ہونے کی وجہ سے عجیب نہیں لگتے۔

مثلاً: ریل گاڑی کا کسی جانور کے کھینچے بغیر چلنا اور نطفے کا رحم میں جا کر زندہ انسان بن جانا، ان دونوں میں عجیب ہونے کے لحاظ سے کیا فرق ہے؟ بلکہ نطفے کا زندہ انسان بن جانا، زیادہ عجیب ہے، مگر جس دیہاتی نے ریل گاڑی کے چلنے کو کبھی نہ دیکھا ہو اور نطفہ کے رحم میں جا کر زندہ انسان ہو جانے کو وہ ہوش سنبھالتے ہی دیکھتا اور سنتا چلا آ رہا ہو تو وہ ضرور ریل گاڑی کے چلنے کو مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے عجیب سمجھے گا اور نطفہ سے انسان بننے کو عجیب تر ہونے کے باوجود عجیب نہیں سمجھے گا۔

اسی طرح جس شخص نے اپنی ذات کی حد تک موبائل فون سے ہمیشہ باتیں نکلتے دیکھا اور سنا، مگر کبھی انسان کے ہاتھ اور پاؤں کو باتیں کرتے نہیں دیکھا، تو وہ موبائل فون کے اس عمل کو عجیب نہیں سمجھتا، جبکہ ہاتھ پاؤں کے بولنے کو عجیب سمجھتا ہے۔ حالانکہ موبائل فون کا بولنا زیادہ عجیب ہے، کیونکہ اس میں تو روح بھی موجود نہیں، جبکہ انسانی ہاتھ پاؤں میں بولنے کے لیے زندگی موجود ہوگی۔ خیر ہاتھ پاؤں کے بولنے کو عجیب سمجھنے کا تو مضائقہ نہیں، لیکن یہ سخت غلطی ہے کہ عجیب کو محال سمجھے اور محال سمجھ کر انکار کرے یا بلا ضرورت اس کی تاویلیں کرے۔

## محال اور مستبعد کا شرعی و ایمانی مسائل پر اطلاق:

یہی اصول دین کے کئی معاملات پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی عقائد میں کچھ چیزیں ہمارے مشاہدے اور تجربے سے ہٹ کر ہیں، لیکن چونکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خبر دی ہے، اس لیے محض عجیب ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کرنا غلط

ہے۔مثلاً:

پل صراط کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا اور انہی اوصاف کے ساتھ لوگوں کا اس پر چلنا، چونکہ محال نہیں صرف مستبعد (عجیب) ہے۔مخبر صادق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے وقوع پذیر ہونے کی خبر دی ہے، اس لیے اس کا انکار کرنا بالکل غلط اور غیر ضروری تاویلات کرنا فضول حرکت ہے۔

## چوتھا اصول

**متن:** موجود ہونے کے لیے محسوس و مشاہد ہونا (نظر آنا) لازم نہیں۔

**وضاحت:**

کسی چیز کے موجود ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ محسوس ہو اور آنکھوں سے نظر بھی آئے۔بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو محسوس نہیں ہوتیں، لیکن وہ حقیقت میں موجود ہوتی ہیں۔حقیقت کو ثابت کرنے کے مختلف ذرائع ہیں، اور ہر چیز کے لیے صرف ظاہری مشاہدہ ضروری نہیں۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کسی چیز کے موجود ہونے کا ثبوت تین طریقے سے ہوتا ہے:

### 1) مشاہدہ:

یعنی آنکھوں سے دیکھ کر کسی چیز کے موجود ہونے کا یقین کرنا۔مثال: ہم نے زید کو آتے ہوئے خود دیکھا، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آیا ہے۔

### 2) مخبرِ صادق کی خبر:

یعنی کوئی سچا و معتبر شخص کسی چیز کے بارے میں خبر دے اور اس خبر کو جھٹلانے والی کوئی مضبوط دلیل نہ ہو۔

مثال: اگر کوئی قابلِ اعتماد شخص بتائے کہ زید فلاں دن آیا تھا، تو ہم اس کی بات کو سچ مانیں گے، بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی مضبوط دلیل نہ ہو۔مثلا: اگر کوئی کہے: زید رات کو آیا اور

تمہیں تلوار سے زخمی کر دیا، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کسی نے زخمی نہیں کیا اور نہ اب تم زخمی ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ خبر جھوٹی کہلائے گی۔ کیونکہ مشاہدہ اسے جھٹلا رہا ہے۔

## 3) استدلال عقلی:

بغیر دیکھے اور بغیر کسی کے بتائے، عقل سے کسی چیز کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگانا۔ مثلاً: دھوپ دیکھ کر پہچان لینا کہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ اگرچہ سورج کو نہ دیکھا ہو اور نہ کسی نے اس کے طلوع ہونے کی خبر دی ہو۔

ان تینوں طریقوں میں "وجود کا حکم" تو سب میں مشترک ہے، لیکن محسوس و مشاہد صرف پہلا طریقہ (مشاہدہ) ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے موجود ہونے کا علم صرف دیکھنے کے ذریعے نہیں ہوتا، بلکہ سچے شخص کی خبر اور عقل کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو موجود کہا جائے وہ محسوس بھی ہو اور نظر بھی آئے اور جو محسوس نہ ہو یا نظر نہ آئے اسے غیر موجود کہا جائے۔

## مثال: آسمانوں کا وجود

قرآن و حدیث نے خبر دی ہے کہ ہم سے بلندی پر "آسمان" نام کے سات عظیم اجسام ہیں۔ اب اگر ظاہری دکھائی دینے والے نیلے خیمے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے وہ اجسام ہمیں نظر نہ آتے ہوں، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صرف نظر نہ آنے کی وجہ سے آسمانوں کے وجود کی نفی کر دی جائے۔ بلکہ آسمانوں کا موجود ہونا فی نفسہ ممکن ہے اور مخبر صادق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان کے موجود ہونے کی خبر دی ہے، اس لیے ان کے وجود کا قائل ہونا ضروری ہے۔

# پانچواں اصول

## متَن:

منقولاتِ محضہ (جو باتیں صرف روایات پر مبنی ہوں) پر دلیل عقلی محض (خالص عقلی دلیل) قائم کرنا ممکن نہیں، اس لیے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں۔

## وضاحت:

واقعات کی ایک قسم "منقولات محضہ" ہے یعنی ایسے واقعات جن کا وجود کسی سچے شخص کی خبر کے ذریعے معلوم ہو۔

منقولات محضہ کے ذریعے حاصل ہونے والی تمام چیزوں کے متعلق ازروئے عقل ممکن ہونے، نہ ہونے پر تو غور کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ازروئے روایت، خبر کے سچے ہونے نہ ہونے کا بھی سوال کیا جاسکتا ہے، لیکن جب سچے شخص کی خبر کے ذریعے ایک جانب راجح اور متعین ہوجائے تو اس نقلی ثبوت کے بعد خالص عقلی دلیل کا مطالبہ ناجائز اور فضول ہے۔ اس لیے کہ "منقولاتِ محضہ" پر "خالص عقلی دلیل" قائم کرنا ممکن نہیں۔

## حسی مثال:

مثلاً کسی نے کہا کہ: "اسکندر" اور "دارا" دو بادشاہ تھے اور ان میں جنگ ہوئی تھی"۔ اس پر کوئی شخص کہے کہ اس جنگ کی کوئی عقلی دلیل پیش کرو، تو دنیا کا کوئی بھی فلسفی یا منطقی اس پر سوائے اس کے اور کیا دلیل دے سکتا ہے کہ:

1) ایسے دو بادشاہوں کا وجود اور ان کے درمیان جنگ ہونا، عقلاً محال نہیں، بلکہ ممکن ہے۔

2) معتبر مؤرخین نے اس جنگ کے وقوع کی خبر دی ہے۔

3) جو ممکن الوقوع چیز کسی معتبر ذریعے سے ہم تک پہنچے، اس پر یقین کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس لیے اس واقعے کا قائل ہونا اور ماننا ضروری ہے۔

## شرعی مثال:

بالکل اسی طرح، دینی غیبی امور کے بارے میں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ قیامت کا آنا، سب مردوں کا زندہ ہونا اور نئی زندگی کا دور شروع ہونا یہ سب غیبی امور ہیں، جو "منقولاتِ محضہ" میں سے ہیں۔ اس لیے کوئی شخص ان چیزوں پر عقلی دلیل کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ:

1) یہ امور عقلی طور پر محال نہیں، بلکہ ممکن ہیں، اگرچہ ہماری سمجھ میں نہ آئیں۔

2) ان کی خبر ہمیں سچے نبی امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

3) جب کوئی چیز ممکن الوقوع ہو اور اس کی خبر کسی سچے ذریعے سے آئے، تو اس پر یقین ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر ہمیں یقین کرنا لازم ہے۔

البتہ، اگر کوئی شخص تعجب دور کرنے کے لیے عقلی دلیل بھی دے دیتا ہے "مثلاً قیامت کے دن اعمال کے وزن کی مثال کے طور پر، تھرمامیٹر سے حرارت کے وزن کو پیش کر دیتا ہے" تو یہ اس کا تبرع اور احسان ہے، اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

## چھٹا اصول

**متن:** نظیر اور دلیل جس کو آج کل ثبوت کہتے ہیں ایک نہیں، اور مدعی سے دلیل کا مطالبہ جائز ہے، مگر نظیر کا مطالبہ جائز نہیں۔

**وضاحت:**

جب کوئی شخص دعویٰ کرے، تو اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اسے "دلیل" پیش کرنا ضروری ہے۔ دلیل پیش نہ کرنے کی صورت میں، اس سے دلیل کا مطالبہ کرنا بھی بالکل درست ہے۔ لیکن اس دعوے کی تصدیق کے لیے "نظیر" کا مطالبہ کرنا اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اسے خلاف عقل اور محال کہنا درست نہیں۔ کیونکہ کسی شئے کا ممکن ہونا "نظیر" کے ملنے پر موقوف نہیں اور نہ ہی نظیر اور دلیل ایک چیز ہے، بلکہ دونوں میں فرق ہے:

**دلیل:**

دلیل کا مطلب ہے "کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی پختہ اور معقول ثبوت دینا" جیسے گواہی، مشاہدہ، یا کسی مستند ذریعے سے حوالہ دینا۔

**نظیر:**

نظیر کا مطلب یہ ہے کہ "کسی بات یا واقعے کی مثال یا مشابہت پیش کرنا" کہ یہ پہلے بھی اسی طرح ہو چکا ہے۔

## حسی مثال:

مثلاً: اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ "بادشاہ اکبر" نے لاہور میں اپنی تخت نشینی کا دربار منعقد کیا تھا" تو اس دعوے کی سچائی کے لیے اس شخص پر دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔ جیسے کہ تاریخی گواہی یا مستند ذرائع سے اس بات کی تصدیق۔

اس پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم تب تک نہیں مانیں گے، جب تک اس کی نظیر نہ پیش کی جائے (یعنی یہ ثابت نہ کیا جائے کہ اس سے پہلے کسی اور بادشاہ نے بھی ایسا کیا تھا) تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ دلیل کے ذریعے کسی واقعے کو ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن ہر واقعے کے لیے نظیر (یعنی پہلے اسی طرح ہونے یا کرنے کی مثال) موجود ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی اس کا مطالبہ درست ہے۔

## شرعی مثال:

دینی باتوں میں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے:

مثلاً اہل شریعت قیامت کے دن اعضائے انسانی "ہاتھ پاؤں" کے بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں، تو ان سے کسی کو یہ مطالبہ کرنا درست نہیں کہ "تم ہمیں یہ دکھاؤ کہ پہلے بھی کسی کا ہاتھ یا پاؤں بول چکا ہے"؟ اور نہ ہی ایسی مثال پیش نہ کرنے پر کسی کو، انہیں جھٹلانے کا حق حاصل ہے۔ البتہ دلیل دینا ان کی ذمہ داری ہے، چونکہ وہ دلیل نقلی ہے، اس لیے یہ کہنا کافی ہے کہ:

1) اعضائے انسانی کا گفتگو کرنا محال اور ناممکن نہیں، بلکہ ممکن ہے۔

2) اس کی خبر ہمیں سچے نبی امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

3) جب کوئی چیز ممکن الوقوع ہو اور اس کی خبر کسی سچے ذریعے سے آئے، تو اس پر یقین ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر ہمیں یقین کرنا لازم ہے۔

## فائدہ:

البتہ اگر مدعی "بات سمجھانے" کے لیے کوئی نظیر بھی پیش کر دے تو یہ اس کی مہربانی ہے، اس پر لازم نہیں۔ مثلاً: موبائل فون کو اس کی نظیر میں پیش کر دے کہ بے جان ہونے کے باوجود کس طرح بولتا ہے، اسی طرح قیامت والے دن "اعضائے انسانی" بولیں گے۔

آج کل ظلم یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ منقول واقعے کی نظیر کا مطالبہ کرتے ہیں، جو کہ غلط ہے۔

# ساتواں اصول

**متَن:** دلیل عقلی ونقلی میں تعارض کی چارصورتیں عقلاً محتمل ہیں:

1) ایک یہ کہ "دونوں قطعی ہوں"۔اس کا کہیں وجود نہیں، نہ ہوسکتا ہے، اس لیے کہ صادقَین (دو سچی دلیلوں) میں تعارض محال ہے۔

2) دوسرے یہ کہ "دونوں ظنی ہوں"۔یہاں جمع کرنے کے لیے گو ہر دو میں "صَرف عن الظاہر" کی گنجائش ہے، مگرلسان کے اس قاعدہ سے کہ اصل الفاظ میں "حمل علی الظاہر" ہے، نقل کو ظاہر پر رکھیں گے اور دلیل عقلی کی دلالت کو حجت نہ سمجھیں گے۔

3) تیسرے یہ کہ "دلیل نقلی قطعی" ہو اور "عقلی ظنی" ہو۔ یہاں یقیناً نقلی کو مقدم رکھیں گے۔

4) چوتھے یہ کہ "دلیل عقلی قطعی" ہو، اور "نقلی ظنی ہو ثبوتاً یا دلالتاً"۔ یہاں عقلی کو مقدم رکھیں گے نقلی میں تاویل کریں گے۔

پس صرف یہ ایک موقع ہے درایت کی تقدیم کا روایت پر، نہ یہ کہ ہر جگہ اس کا دعوی یا استعمال کیا جاوے۔

**وضاحت:**

بعض لوگ عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض کے وقت، ہمیشہ عقلی دلیل کو مقدم سمجھتے ہیں اور نقلی دلیل کو تابع قرار دیتے ہیں، یہ طرز عمل ہرگز درست نہیں۔ کیونکہ ممکنہ طور پر عقلی اور نقلی دلیل میں ظاہری تعارض یا ٹکراؤ کی چار صورتیں بنتی ہیں، ہر ایک صورت کا اپنا خاص حکم ہے۔ان چار صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں "دلیل عقلی" کو "دلیل نقلی" پر ترجیح حاصل ہے۔

اس اجمال کی تفصیل سمجھنے سے پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کر لیجیے:

دلیل نقلی: سچے اور معتبر مخبر کے ذریعے پہنچنے والی خبر۔دلیل شرعی اسی میں داخل ہے......دلیل عقلی: بغیر دیکھے اور بغیر کسی کے بتائے، عقل سے کسی چیز کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگانا۔ مثلاً: دھوپ دیکھ کر پہچان لینا کہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔تعارض: دو چیزوں کا اس طرح ایک دوسرے کے مخالف ہونا کہ ایک کو صحیح ماننے سے دوسرے کو غلط ماننا لازم

آئے۔تاویل: کلام کواس کے ظاہری معنی سے،احتمالی معنی کی طرف پھیرنا۔

## دلیل نقلی اور عقلی میں تعارض کی چار ممکنہ صورتیں

### پہلی صورت (دلیل نقلی وعقلی دونوں قطعی ہوں):

اگر دونوں دلیلیں ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ہوں،تو ان میں کبھی بھی تعارض نہیں ہوسکتا۔

**مثال:**

چونکہ دو یقینی سچی دلیلوں میں تعارض ہونا محال اور ناممکن ہے۔اس لیے اس کی قیامت تک کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

### دوسری صورت (دلیل نقلی وعقلی دونوں ظنی ہوں):

اگر دونوں دلیلیں ظنی ہوں،تو دلیل نقلی ظنی کو ظاہر پر رکھتے ہوئے،دلیل عقلی پر ترجیح دیں گے اور دلیل عقلی ظنی کو غلط سمجھیں گے۔کیونکہ دلیل عقلی کے "ظنی" ہونے کی وجہ سے بھی یہ احتمال موجود ہے کہ ممکن ہو کہ غلط ہو۔یہ احتمال تو نقلی ظنی میں بھی ہے،مگر دلیل نقلی ظنی کو لازمی ماننے پر صحیح دلائل موجود ہیں،جبکہ دلیل عقلی ظنی کو لازمی ماننے پر کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔

اگرچہ اس صورت میں دلیل نقلی کو ماننے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس میں تاویل کرکے،اسے ظاہری معنی سے پھیرلیں،لیکن چونکہ بغیر ضرورت کے تاویل کرنا منع ہے، اور یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے،اس لیے بلاضرورت تاویل نہیں کریں گے۔

**مثال:**

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (الانبیاء:33)

ترجمہ:وہی ذات ہے جس نے رات اور دن کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو بھی۔

ان میں سے ہر ایک آسمان میں (اپنے مدار میں) تیر رہا ہے۔

اس آیت سے استدلال سمجھنے کے لیے سمجھیے کہ ہمارے نزدیک سورج دو طرح سے حرکت کرتا ہے۔

1) حرکت اَینِیَّہ: سورج کا ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا۔
جیسے روزانہ سورج مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہے یا اپنی کہکشاں سمیت شمال کی طرف مسلسل چلتا ہے۔ اسے مداری حرکت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

2) حرکت وضعیہ: سورج کی محوری حرکت۔ جیسے: گول چیز اپنے محور پر چکی کی طرح گھومتی ہے۔

کیونکہ آیت کریمہ میں سورج اور چاند کے بارے میں "یَسبَحُون" ذکر کیا گیا ہے، جو "سَبَاحَة" بمعنی "تیرنا" سے مشتق ہے۔ ظاہر ہے کہ تیرنے میں، تیرنے والے کا جسم پانی کو چیر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورج اور چاند بھی آسمان پر اپنے کل جسم کے ساتھ ادھر سے ادھر کو منتقل ہوتے ہیں۔

تو اس آیت کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سورج اپنے مدار پر ساکن نہیں بلکہ گردش کر رہا ہے۔ یہ آیت تو قطعی ہے لیکن اس آیت میں "یَسبَحُون" سے "مدار پر گردش" مراد لینا ظنی ہے۔ بعض حکماء سورج کی صرف "محوری" حرکت مانتے ہیں، جبکہ مدار پر گردش کا انکار کرتے ہیں، مگر ان کے پاس اس کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، بلکہ عقلی ظنی ہے۔ اب یہاں پر دلیل نقلی ظنی اور عقلی ظنی میں تعارض ہو گیا۔ لہٰذا دلیل نقلی ظنی کو ترجیح حاصل ہے، جبکہ دلیل عقلی ظنی قابل رد ہے۔ اس لیے یہ ماننا ضروری ہے کہ سورج اپنے مدار پر ساکن نہیں، بلکہ گردش کر رہا ہے۔

## تیسری صورت (دلیل نقلی قطعی اور عقلی ظنی ہو):

جب "دلیل نقلی قطعی" اور "دلیل عقلی ظنی" ہو، تو اس کا حکم دوسری صورت کی طرح ہے، یعنی "دلیل نقلی" کو ترجیح دیں گے، جبکہ دلیل عقلی کو رد کر دیں گے۔ کیونکہ جب "دلیل نقلی ظنی" کو "دلیل عقلی ظنی" پر ترجیح حاصل ہے، تو "دلیل نقلی قطعی" کو "دلیل عقلی ظنی" پر بدرجہ اولی ترجیح حاصل ہوگی۔

## مثال:

چونکہ اس صورت کا حکم بھی وہی ہے، جو دوسری صورت کا ہے، اس لیے اس صورت کی الگ سے مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

## چوتھی صورت (دلیل عقلی قطعی اور دلیل نقلی ظنی ہو):

اگر دلیل عقلی قطعی اور دلیل نقلی ظنی ہو، جس کی دو صورتیں ہیں:

1) ظنی ثبوتاً: کہ خبر کے پہنچنے کے واسطے میں یا اس کی سند میں شبہ ہو۔

2) ظنی دلالتاً: کہ الفاظ کے معانی میں ایک سے زیادہ احتمال ہوں۔

تو اس صورت کا حکم یہ ہے کہ عقلی دلیل کو قطعی ہونے کی وجہ سے مقدم رکھا جائے گا۔ دلیل نقلی اگرچہ ظنی ہے، لیکن چونکہ نقلی ظنی کو ماننا بھی ضروری ہے، اس لیے دلیل نقلی میں بھی تاویل کر کے، ظاہری معنی سے پھیر کر ایسے معنی پر محمول کیا جائے گا کہ دلیل عقلی کے ساتھ تطبیق ہو جائے۔

## مثال:

قرآن مجید کی سورۃ کہف میں ارشاد ربانی ہے:

**وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ** (الکھف:86)

ترجمہ: اور ذوالقرنین نے سورج کو پایا کہ وہ ایک کیچڑ جیسے (سیاہ) چشمے میں غروب ہو رہا ہے۔

قرآن مجید کے ظاہری الفاظ (دلیل نقلی) میں غور کرنے سے پہلے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے، کہ سورج زمین کے کسی کیچڑ والے چشمے میں غروب ہوتا ہے۔ حالانکہ قطعی عقلی دلیل سے ثابت ہے کہ سورج طلوع سے لے کر غروب تک کسی بھی مرحلے میں اپنی گردش کے درمیان زمین سے نہیں لگتا اور نہ ہی سورج زمین میں غروب ہوتا ہے۔

اب یہاں پر دلیل عقلی قطعی اور نقلی ظنی میں اختلاف ہو گیا، اصولی حکم کے مطابق دلیل عقلی قطعی کو ترجیح دیں گے، جبکہ نقلی ظنی میں تاویل کریں گے، کہ حقیقت میں سورج کسی کیچڑ جیسے سیاہ چشمے میں غروب نہیں ہو رہا تھا، بلکہ ذوالقرنینؒ کو "بظاہر" ایسے لگا کہ جیسے سورج کسی چشمے میں

غروب ہورہا ہے۔ جس طرح سمندری سفر کرنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج سمندر میں غروب ہورہا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں سورج سمندر میں غروب نہیں ہوتا۔

**تنبیہ:**

مذکورہ چار صورتوں میں سے یہ چوتھی صورت وہ خاص موقع ہے، جہاں دلیل عقلی کو دلیل نقلی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ہر جگہ عقل کا اعتبار کرنا اور نقل کو چھوڑ دینا قطعاً غلط ہے۔ اور اس چوتھی صورت میں بھی عقلی دلیل کو نقلی دلیل پر مقدم کرنا، دراصل نقلی دلیل کا ترک کرنا نہیں، بلکہ تاویلی معنی کے اعتبار سے تعمیل اور دونوں میں تطبیق ہے۔

**فائدہ:**

ممکنہ طور پر دو صورتیں اور بھی بن سکتی ہیں، پہلی صورت: دلیل نقلی قطعی ہو اور دلیل عقلی وہمی وخیالی ہو۔ دوسری صورت: دلیل نقلی ظنی ہو اور دلیل عقلی وہمی اور خیالی ہو۔
ان دونوں صورتوں کا حکم بالکل ظاہر ہے کہ دلیل وہمی وخیالی کی دلیل نقلی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔

## پہلا انتباہ: ”مادہ“ کا حادث ہونا

### ضروری اصطلاحات:

**مادہ:** اسے ہَیولیٰ بھی کہتے ہیں۔ ”مادہ“ سے مراد ہر چیز کی اصل اور وہ عنصر ہے، جس سے کائنات کی تمام مادی چیزیں بنی ہیں۔ یہ انسانی تصور سے بھی زیادہ بسیط ہے۔

**قدیم:** وہ چیز جو ہمیشہ سے موجود ہو۔ اس پر کبھی عدم طاری نہ ہوا ہو۔

**حادث:** یہ قدیم کی ضد ہے یعنی ایسی چیز جو پہلے موجود نہ ہو، بعد میں وجود میں آئے۔

**صورت جسمیہ:** مخصوص صورت کا لحاظ کیے بغیر کسی چیز کی جسمانی شکل وہیئت۔

**صورت نوعیہ:** وہ خاص صورت جس کی وجہ سے کوئی چیز دوسری انواع سے الگ ہو جاتی ہے۔

**صورت شخصیہ:** ہر چیز کی وہ خاص صورت جو شئے کو اسی نوع کی دیگر اشیاء سے ممتاز کرتی ہے۔
مثلاً: زید ایک شخص ہے۔ جس چیز سے یہ بنا ہے اسے ”مادہ“ کہتے ہیں۔ اس کی

جسمانی ہیئت کو "صورت جسمیہ" کہتے ہیں۔اس کا انسان ہونا "صورت نوعیہ" ہے۔اس کی مخصوص شکل وصورت (ناک نقشہ، رنگ روپ، قدوقامت وغیرہ) "صورت شخصیہ" ہے۔ یہ پہلے نہیں تھا، بعد میں موجود ہوا، یہ اس کا "حادث" ہونا ہے۔

## آغاز انتباہ

### اسلامی عقیدہ:

اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات "قدیم" ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس پر کبھی عدم طاری نہیں ہوا۔اس کے علاوہ کائنات کی تمام چیزیں "حادث" ہیں یعنی ان کا وجود پہلے نہ تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ کی عطا سے انہیں عارضی اور فانی وجود ملا۔

### جدید فلاسفہ اور اہل سائنس کی غلطی:

جبکہ دوسری طرف فلاسفہ اور اہل سائنس کا عقیدہ ہے کہ مادہ (وہ بنیادی عنصر جس سے کائنات کی تمام چیزیں بنی ہیں) بھی قدیم ہے، یعنی وہ بھی ہمیشہ سے موجود ہے۔حالانکہ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی چیز کو قدیم ماننا درحقیقت شرک اور بہت بڑی غلطی ہے۔

### قدیم فلسفیوں اور جدید فلسفیوں میں فرق:

قدیم یونانی فلسفیوں نے بھی "مادے" کو قدیم قرار دیا تھا، لیکن ان کے پاس ٹوٹی پھوٹی کچھ دلیلیں موجود تھیں، اگرچہ وہ بھی باطل تھیں۔جدید سائنس، جو بظاہر مادیت پرستی کی بنیاد پر کھڑی ہے، اس کے پاس تو کوئی ٹوٹی پھوٹی دلیل بھی موجود نہیں۔محض اندازوں اور تخمینوں سے ہی کام لیا ہے۔

### مادہ کے قدیم ہونے پر جدید فلاسفہ اور اہل سائنس کی دلیل:

اگر "مادہ" پہلے معدوم تھا پھر موجود ہوا تو "عدم سے یکا یک مادے کا وجود میں آنا سمجھ میں نہیں آتا"۔اس لیے "مادہ" کا عدم سے وجود میں آنا محال ہے، لہذا "مادہ" قدیم ہے۔

## جدید فلاسفہ اور اہل سائنس کے باطل نظریے کی الزامی تردید:

غور طلب بات یہ ہے کہ کیا "کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا" اس کے باطل ہونے کی دلیل بن سکتا ہے؟ کیونکہ اگر مادے کا پہلے معدوم ہونا، بعد میں موجود ہونا سمجھ میں نہیں آتا، تو اس کا پہلے معدوم ہونے کے بجائے شروع سے ہی موجود ہونا بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ مادے کے وجود کی تمام تبدیلیوں میں سے ہر تبدیلی پہلے معدوم تھی، بعد میں وجود میں آئی، تو خود مادہ کیسے معدوم نہیں تھا؟ آخر ان تبدیلیوں کے وجود اور مادے کے وجود میں فرق کیا ہے؟ لہٰذا "سمجھ میں نہ آنا" تو قدیم ماننے اور نہ ماننے دونوں میں مشترک ہوا۔

## مستقل دلیل کے ساتھ تردید:

البتہ "مادہ" کو قدیم ماننے میں اصل خرابی یہ ہے کہ اس کے باطل ہونے پر مستقل دلیل بھی موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ سائنس میں مادہ کو ایک مدت تک "صورت جسمیہ" سے خالی مانا گیا ہے، جبکہ اصولاً یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مادہ کا "صورت جسمیہ" سے خالی ہونا محال ہے، یقیناً اس کا وجود ہمیشہ کسی نہ کسی شکل وصورت ہی میں ظاہر ہوگا۔

لہٰذا مادے کو موجود کہنا، لیکن موجود ہونے کے لیے لازم (مادے کی صورت) کو نہ ماننا حقیقت میں دو متضاد چیزوں کے جمع ہونے کا قائل ہونا ہے۔ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ "مادہ" موجود تھا اور دوسری طرف آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ بغیر صورت کے موجود تھا جو کہ ناممکن ہے۔ اس دلیل سے تو خود مادے کا وجود ہی مشکوک ہو گیا، اس کے قدیم ہونے کی کیا بات کی جائے، کیونکہ قدیم تو جب ہو کہ پہلے موجود ہو۔

## فلاسفہ قدیم کے نظریے کی تردید:

اور اگر فلاسفہ قدیم کی طرح ازل میں مادے کا وجود شکل وصورت سمیت مانا جائے، تب بھی مادہ کو قدیم ماننا باطل ہے، اس لیے کہ "مادہ" میں کوئی صورت بھی مانی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی صورت جسمیہ، صورت نوعیہ کے بغیر اور کوئی بھی صورت نوعیہ صورت شخصیہ کے بغیر نہیں پائی جاسکتی، لہٰذا مادے میں جب کوئی صورت مانی جائے گی تو یقیناً وہاں صورت شخصیہ بھی ہوگی اور صورت شخصیہ بدلتی رہتی ہے، تو جب بعد والی صورت شخصیہ آئی تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو

پہلی صورت باقی رہی یا ختم ہوگئی؟

اگر پہلی صورت باقی رہی تو چونکہ شخص ہونا صورت شخصیہ سے ہوتا ہے، تو پہلی صورت کے باقی رہتے ہوئے، دوسری صورت آنے کی وجہ سے، لازم آئے گا کہ شخص دو شخص ہو جائیں اور یہ محال ہے۔ اور اگر پہلی صورت ختم ہوگئی تو لازم آئے گا کہ قدیم نہ تھی، کیونکہ قدیم کا ختم ہونا بھی محال ہے۔ لہٰذا وہ حادث ہوئی یعنی پہلے معدوم تھی بعد میں وجود میں آئی۔ صورت شخصیہ کے حادث ہونے سے صورت نوعیہ اور صورت جسمیہ کا بھی حادث ہونا ثابت ہوگیا، کیونکہ یہ صورتیں بغیر صورت شخصیہ کے نہیں پائی جاتیں۔ لہذا مادہ کا قدیم ہونا باطل ثابت ہوا۔

## کلمہ گو متبعین فلاسفہ کی حالت:

مسلمانوں میں اس عقیدے کے ماننے والے اسلام اور سائنس دونوں کے خلاف ہیں۔ کیونکہ اسلام مادے کو قدیم نہیں کہتا، یہ قدیم کہتے ہیں تو یہ متبع اسلام نہ ہوئے۔ اہل سائنس خدا کا مشاہدہ ممکن نہ ہونے کی وجہ سے، خدا کے انکاری ہیں، یہ زبان سے وجود خدا کا اقرار کرتے ہیں، تو متبع سائنس بھی نہ ہوئے۔

## مادے کو قدیم ماننے کی قباحت:

مادہ کو قدیم ماننے کا نظریہ اس لیے بھی قبیح ہے، کہ اگر ہم فرض کرلیں کہ مادہ قدیم ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مادہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں۔ کیونکہ قدیم چیز واجب الوجود ہوتی ہے یعنی اس کا وجود ذاتی اور خود بخود ہوتا ہے، وہ اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں ہوتی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مادہ اور اس سے بنی کائنات اللہ کی محتاج نہیں ہے، تو پھر اللہ کے وجود کی کیا ضرورت ہوئی، نعوذ باللہ۔ الحاصل! مادہ کو قدیم ماننے سے اللہ کی ذات کی نفی لازم آتی ہے جو یقیناً باطل ہے۔

## شبہ:

قدیم کی دو قسمیں ہیں:

(1) قدیم بالذات: کوئی ذات اپنے وجود میں مستقل ہو، غیر کی محتاج نہ ہو۔

(2) قدیم بالزمان: کوئی چیز ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے، کبھی معدوم نہ ہو، لیکن اس کا وجود

ذاتی نہ ہو، غیر کا محتاج ہو۔

اللہ تعالیٰ قدیم بالذات اور قدیم بالزمان دونوں ہے، یعنی اللہ تعالی اپنے وجود ذاتی وصفاتی میں بھی کسی کا محتاج نہیں، اور زمانے کے اعتبار سے بھی ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، جبکہ مادہ قدیم بالذات نہیں ہے، صرف قدیم بالزمان ہے۔

ذات الٰہی اور مادے میں مذکورہ فرق نکالنے سے چونکہ "مادہ" اپنے وجود میں خالق کا محتاج ہو جاتا ہے، لہٰذا مادے کو قدیم بالزمان مانتے ہوئے بھی خدائے برحق کا قائل ہوا جا سکتا ہے۔ اس سے ذات الٰہی کی نفی لازم نہیں آتی؟

## جواب:

مادے کو قدیم بالذات مانیں یا قدیم بالزمان بہرصورت باطل ہے، کوئی تاویل اور توجیہ اس کے لیے کار آمد نہیں ہے۔ البتہ یہ خیال چونکہ بعض پرانے فلسفیوں کا تھا، موجودہ دور کے فلاسفہ اس عقیدے کے قائل نہیں، اسی لیے یہاں اس کا تفصیلی جواب ترک کیا جا رہا ہے۔

## "مادہ" کے قدیم ہونے کے متعلق دو مغالطے:

### پہلا مغالطہ:

فلسفی دی مقراطیس (460-370ق م) کا نظریہ یہ ہے کہ، مادہ انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں قدیم تھا۔ وہ اس طرح کہ مادہ انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کی شکل میں تھا جن کو تقسیم کرنا عقل اور خیال کے ذریعے تو ممکن تھا، لیکن ان کی حقیقی تقسیم ممکن نہ تھی۔ انہی چھوٹے چھوٹے ذرات کے آپس میں ملنے سے دنیا کی چیزیں بنیں۔ دنیا میں جو کچھ تبدیلی نظر آتی ہے، یہ تبدیلی صرف مادہ کے ذرات کی کمی بیشی اور افتراق واجتماع کی وجہ سے ہے، اصل مادے میں کوئی تبدیلی نہیں، جب اصل مادہ اپنی ذات کے لحاظ سے تبدیلی سے محفوظ ہے، تو مادے کے حادث ہونے کی کوئی دلیل نہیں رہی۔

### دوسرا مغالطہ:

کچھ دوسرے فلاسفہ کا مذہب یہ ہے کہ پہلے "مادہ" مجتمع صورت میں قدیم تھا، اس میں ذرات اور چھوٹے چھوٹے اجزا نہ تھے۔ کائنات میں جو اشیاء موجود ہیں، وہ سب اسی مجتمع صورت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو ہو کر متفرق ترکیبوں سے مل کر بنیں۔ کائنات میں جو مختلف صورتیں

نظر آرہی ہیں یہ سب مادہ کے اجزاء تحلیلیہ (اجزائے اولی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے) ہیں۔

## دونوں مغالطوں کا حاصل:

دونوں مغالطوں کا حاصل یہی ہے کہ مادہ کی ذات تو دونوں صورتوں (متفرق باریک اجزا مان کر مرکب مانیں یا مجتمع ومرکب مان کر، اجزائے تحلیلیہ کے اعتبار سے متفرق مانیں) میں باقی اور متغیر ہونے سے محفوظ ہے۔ تغیر ہی حادث ہونے کی بنیاد ہے، لہذا "مادہ" قدیم ہوا۔

## دونوں مغالطوں کی تردید:

"مادہ" کے اجزاء جس صورت میں بھی قدیم مانیں، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:...... یا تو یہ ذرات اور اجزا پہلے متحرک ہوں گے...... یا...... پھر ساکن؟...... کیونکہ کوئی بھی مادہ ان دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔

تو اب سوال یہ ہے کہ یہ ذرات اور اجزاء ہمیشہ متحرک تھے یا ساکن؟

اگر متحرک تھے، تو ان کی حرکت بھی قدیم تھی اور اگر ساکن تھے تو ان کا سکون بھی قدیم تھا۔ حالانکہ اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ مادہ سے بنے بعض اجسام متحرک ہیں، جن سے سکون ختم ہو گیا، جبکہ بعض اجسام ساکن ہیں، جن سے حرکت ختم ہو گئی۔ الغرض! حرکت اور سکون دونوں کو ختم ہوتا دیکھ رہے ہیں، حالانکہ قدیم کا ختم ہونا محال ہے۔ کیونکہ جو چیز ختم ہونے والی ہو، وہ قدیم نہیں، حادث ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ مادہ کے یہ اجزاء قدیم نہیں ہیں، جب اجزاء قدیم نہیں ہیں تو مادہ کیسے قدیم ہو سکتا ہے؟

## غیر موجود میں خدا تعالی کا تصرف سمجھ میں نہ آنا:

اور اگر مادے کے حادث ماننے میں یہ امر رکاوٹ ہے کہ معدوم اور غیر موجود شئے میں، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تصرف سمجھ میں نہیں آتا، تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ محض مستبعد (عجیب) اور غائب کو موجود پر قیاس کرنا ہے، جبکہ محسوسات ومشاہدات پر غائب اور غیر محسوس باتوں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا جا چکا کہ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔

## مادے کے قدیم ہونے کی نقلی دلیل سے تردید:

اب تک مادے کے قدیم ہونے کے خلاف، جتنے دلائل عرض کئے گئے، ان سے قطع نظر کر کے اگر غور کیا جائے تو بھی مادہ قدیم نہیں ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اگر بالفرض مان لیں کہ مادہ

کے حادث ہونے پر کوئی دلیل نہیں، تو فلاسفہ کے پاس مادہ کے قدیم ہونے پر بھی تو کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ اس صورت میں ممکنہ طور پر مادے کا قدیم ہونا اور نہ ہونا دونوں باتوں کا احتمال اور امکان ہے، جہاں عقلا دونوں احتمال ہوں، ایسی صورت میں اگر سچا خبر دینے والا کسی ایک جانب کو متعین کر دے تو اسے قبول کرنا واجب ہوتا ہے۔

یہاں پر مخبر صادق کی طرف سے "مادہ" کے حادث ہونے کی جانب کو متعین فرمادیا گیا ہے، اس لیے مادہ کے حادث ہونے کا قائل ہونا ضروری ہے، ارشاد ربانی ہے: "بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" (البقرۃ:117) اللہ تعالی موجد ہیں آسمانوں اور زمین کے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْئٌ غَيْرُهُ" (صحیح بخاری:3191) کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس وقت بھی موجود تھی، جب اس کے سوا کسی بھی چیز کا وجود نہیں تھا۔

اس آیت مبارکہ اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ پہلے صرف اللہ تھا اور کچھ نہیں تھا۔ سب چیزیں اللہ تعالی نے بعد میں پیدا فرمائیں۔ لہذا نقلی طور پر بھی "مادہ" کے حادث ہونے کا اعتقاد واجب، جبکہ قدیم ہونے کا اعتقاد شرک اور غلط ہے۔

## دوسرا انتباہ: قدرت الٰہی سے متعلق غلط فہمیاں

### اسلامی عقیدہ:

اللہ تعالیٰ کی قدرت کامل اور عام ہے، یعنی وہ جو چاہے، جب چاہے، جیسے چاہے کر سکتا ہے اور اس کی قدرت کسی بھی حد یا قانون میں مقید نہیں۔

### متجددین کی قدرت الٰہی سے متعلق غلطی:

تجدد پسند طبقہ، جو سائنسی اصولوں اور عقلی استدلال کو بنیاد بناتا ہے، بعض اوقات اللہ کی قدرت کا انکار یا اس کو محدود کر دیتا ہے۔ ان کے بقول فطرت کے قوانین (مشاہدے، تجربے اور عادت کی موافقت قانون فطرت کہلاتا ہے) ناقابلِ تغیر ہیں، لہٰذا خلافِ فطرت (موجودہ ترتیب کے خلاف) کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی۔

نتیجتاً متجددین معجزات کا بالکل انکار یا ان میں باطل تاویل کرتے ہیں، جبکہ کرامات کا بالکل انکار کرتے ہیں، کیونکہ معجزات اور کرامات عام فطری قوانین سے ہٹ کر وجود میں آتے ہیں۔

## متجددین کے دلائل اور ان کی تردید:

"خلافِ فطرت کوئی چیز واقع نہیں ہوسکتی"۔اس معاملے میں تجدد پسند طبقے کی طرف سے دوطرح دلیلیں دی جاتی ہیں، کبھی عقلی رنگ میں اور کبھی نقلی پیرائے میں۔اس کے علاوہ ایک تیسری دلیل عقلی اور نقلی مقدمات سے مرکب بنا کر بھی پیش کی جاتی ہے:

### 1) عقلی دلیل:

عقلی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ" آگ ہمیشہ جلاتی ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ہمیشہ ماں باپ کے باہمی ملاپ سے پیدا ہوتا ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا"اس سے معلوم ہوا کہ قانون فطرت کے خلاف ہونا محال ہے۔لہٰذا آگ کا نہ جلانا، بغیر باپ کے بچے کا پیدا ہونا یا عام فطری قوانین سے ہٹ کر کسی معجزے کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

### عقلی دلیل کی تردید:

یہ دلیل نہیں بلکہ مغالطہ ہے، کیونکہ یہ کہنا کہ" خلاف فطرت کوئی امر واقع نہیں ہوسکتا" یہ ایک دعوی ہے، دعوی کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔صرف یہ کہنا دلیل نہیں بن سکتا کہ "ہم نے کبھی ایسا دیکھا نہیں ہے، اس لیے کہ:

1) کسی چیز کا نہ دیکھنا اس کے"موجود نہ ہونے" کی دلیل نہیں ہے۔اگر کسی نے امریکا نہ دیکھا ہو تو کیا اس سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ امریکہ موجود نہیں ہے؟

2) یہ استقراء ناقص ہے یعنی چند جزئیات کا مشاہدہ کرنا۔اس سے دوسری جزئیات جن کا مشاہدہ نہیں کیا، ان پر قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

البتہ ظن کے درجے میں دوسری جزئیات کے لیے بھی اس حکم کو ثابت کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ظن بھی صرف وہاں معتبر ہوگا، جہاں اس سے زیادہ قوی اور طاقتور دلیل اس کے خلاف نہ ہو۔جہاں زیادہ طاقتور دلیل موجود ہو، اس کے مطابق ماننا اور عمل کرنا ضروری ہے، اور یہاں "معجزات کی صورت میں، خلاف فطرت بات کے واقع ہوجانے پر، قرآن وسنت کی قوی دلیل موجود ہے" جسے تسلیم کرنا لازم ہے۔بلاضرورت اس میں تاویل فاسد کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

3) معجزات عقل کے خلاف نہیں، عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔محال عقلی اور چیز ہے،

محال عادی اور چیز ہے۔لوگ محال عادی کو محال عقلی سمجھ لیتے ہیں۔

## 2) نقلی دلیل:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:" فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا"(الفاطر:43)پس تم اللہ تعالی کے معمول میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ "فطرت کے خلاف" کوئی چیز واقع نہیں ہوسکتی، کیونکہ فطرت اللہ تعالی کا معمول ہے، اور اللہ تعالی کے معمول میں تبدیلی ناممکن ہے۔

## نقلی دلیل کی تردید:

اس آیت سے مذکورہ دعوے پر استدلال کا صحیح ہونا موقوف ہے، دو امور پر:

1) آیت میں مذکور لفظ "سنت" یعنی "معمول" سے مراد تمام معمولات ہوں۔

2) "تَبْدِيْلًا" کا فاعل یعنی تبدیلی کرنے والا عام ہو چاہے اللہ ہو یا غیر اللہ۔

گویا آیت کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالی کے کسی معمول کو کوئی بھی تبدیل نہیں کرسکتا، نہ اللہ نہ غیر اللہ۔حالانکہ ان دونوں امور پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاق وسباق کی روشنی میں یہاں "سنت" یعنی معمول سے خاص معمول "باطل پر حق کا غلبہ" مراد ہے کہ حق ہمیشہ غالب رہے گا، چاہے دلیل کے ذریعے ہو یا جہاد کے ذریعے، اس معمول میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اگر "سنت" یعنی معمول کو عام مانا جائے تو پھر "تَبْدِيْلًا" کا فاعل خاص ہوگا یعنی "غیر اللہ"۔اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت (معمولات) میں کوئی غیر اللہ زبردستی نہ تبدیلی کرسکتا ہے اور نہ کرواسکتا ہے۔جیسے دنیا میں بعض سرکاری احکام میں سیاسی مخالفین دباؤ ڈال کر تبدیلی کروا لیتے ہیں، اللہ تعالی کے جاری کردہ احکام میں کوئی غیر اللہ ایسی تبدیلی نہیں کرواسکتا۔

## عقلی ونقلی مقدمات سے مرکب دلیل:

"قانون فطرت کے خلاف ہونا محال ہے" سے متعلق، تیسری دلیل عقلی اور نقلی دو مقدمات سے مرکب ہے:

مقدمہ عقلی: اللہ تعالی کا معمول یعنی کسی کام کا اللہ تعالی کی طرف سے بار بار ایک ہی طرح ہونا ایک "عملی وعدہ" ہے۔

مقدمہ نقلی: اللہ تعالی کا اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنا قرآن کریم کے مطابق محال ہے "اِنَّ اللہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ" (آل عمران: 9)۔ اس سے معلوم ہوا کہ "معمول الٰہی" کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔

## تردید:

دلیل کا دوسرا جز تو بالکل صحیح ہے، لیکن پہلا جز کہ "اللہ تعالی کا معمول ایک عملی وعدہ ہے" ہمیں تسلیم نہیں۔ یہاں اس کی دو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ "اللہ تعالی کے معمول کو "عملی وعدہ" کہنا درست نہیں۔

## پہلی مثال:

موسم برسات میں بارش ہوتے ہوتے جب پہلی بار کسی سال بارش نہیں ہوئی ہوگی، تو اگر یہ معمول یعنی موسم برسات میں بارش کا برسانا اللہ تعالی کا عملی وعدہ تھا، تو اس وعدے کی خلاف ورزی کیسے ہوگئی؟ حالانکہ اللہ تعالی کے وعدے کے خلاف ہونا تو محال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کا معمول عملی وعدہ نہیں ہوتا، لہذا اس کے خلاف ہونا محال نہیں۔

## دوسری مثال:

اسی طرح ہم جانتے ہیں، کہ تبدیلیاں سب حادث ہیں۔ جب مادے میں مخلوق کی کوئی پہلی قسم پیدا ہوئی ہوگی اور ایک عرصے تک اسی نوع کے افراد پیدا ہوتے رہے ہونگے تو یہی عادت "معمول" بن گئی۔ اگر یہ معمول "عملی وعدہ" تھا تو پھر معمول کے خلاف دوسری نوع کے افراد پیدا ہوکر، اس عملی وعدے اور معمول کی خلاف ورزی کیسے ہوگئی؟

اس سے بھی صاف معلوم ہوا کہ "معمول" کو "عملی وعدہ" کہنا درست نہیں۔

## شبہ:

یہ معمول کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ اصل معمول طبعی اسباب پر اثرات کو مرتب کرنا ہے مثلاً بادل ہوں گے تو بارش ہوگی، بادل نہیں ہوں گے تو بارش بھی نہیں ہوگی، تو طبعی

اسباب پر اثرات کو مرتب کرنا یہ "معمول" میں داخل ہے، نہ کہ اس کے خلاف؟

**جواب:**

طبعی اسباب خود اللہ تعالی کی قدرت اور ارادے کے محتاج ہیں۔ اس لیے اصل معمول اللہ تعالی کا اپنی قدرت اور ارادے سے کرنا ہے۔ اسی لیے خلافِ معمول چیزیں بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اصل معمول (قدرت و ارادے) کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ پس! اگر کوئی چیز بظاہر فطرت کے خلاف نظر آئے، تب بھی وہ اللہ کے اصل معمول کے مطابق ہی ہوگی۔ لہٰذا معجزات کا انکار یا ان میں تحریف اور غلط تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

## تیسرا انتباہ: نبوت سے متعلق غلط فہمیاں

**ضروری اصطلاحات:**

**وحی کی تعریف:** وحی کا لغوی معنی ہے: "جلدی سے، کسی بھی طرح، کوئی اشارہ کرنا"

**اصطلاحاً:** وحی وہ ذریعہ ہے، جس سے اللہ تعالی اپنا کلام اپنے کسی منتخب بندے اور رسول تک پہنچا کر، اس کے ذریعے تمام انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔

**معجزہ کی تعریف:** معجزہ اس خلاف عادت اور لوگوں کو عاجز کر دینے والے کام کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔

**جادو کی تعریف:** خفیہ طریقوں، شیطانی طاقتوں یا مخصوص عملیات کے ذریعے، ایسا کام انجام دینا، جو خلاف عادت امر کے ساتھ مشابہ ہو، اصل میں خلاف عادت نہیں، بلکہ مخفی اسباب پر مرتب ہو۔

**کرامت کی تعریف:** کرامت اس خلاف عادت کام کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کی توقیر بڑھانے کے لیے، ان کے ہاتھ پر ظاہر فرماتے ہیں۔

**شعبدہ بازی:** ہاتھ کی صفائی اور چالاکی سے، نظر کا دھوکہ دے کر بظاہر خلاف عادت کام دکھانا۔

**مسمریزم:** خاص طریقے سے خیالات کنٹرول کرنا "مسمریزم" کہلاتا ہے۔ اس میں دوسرے انسان کے خیال پر اپنی قوت ارادی سے عمل کر کے، اس کی قوت ارادی کو کمزور یا سلب کرلیا جاتا ہے۔

## اسلام میں عقیدہ نبوت کی حیثیت:

نبوت کا تصور اسلامی عقائد میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو منتخب کیا اور ان پر وحی نازل فرمائی۔ تاہم، جدید دور کے کچھ متجددین اور منکرین، وحی و نبوت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔ اس انتباہ میں وحی، نبوت، معجزات سے متعلق، سات غلطیوں پر تنبیہ کی گئی ہے، جبکہ جدید دور کے شبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔

## پہلی غلطی: حقیقت وحی کا انکار

سب سے پہلی غلطی وحی کی حقیقت کے بارے میں ہے۔ بعض مدعیان اجتہاد "وحی کی حقیقت" کو تسلیم نہیں کرتے اور اسے محض "وہم" اور "خیال" قرار دیتے ہیں۔ ان کے بقول کچھ لوگوں میں فطری طور پر اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور قوم کی ہمدردی کا جوش اور جذبہ زیادہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان پر ہر وقت خیالات کا غلبہ رہتا ہے۔

وہ خیالات اس قدر غالب آجاتے ہیں کہ بعض دفعہ انہی غلبہ خیالات کی وجہ سے انہیں آواز بھی سنائی دینے لگتی ہے، اور کبھی کوئی شکل بھی نظر آتی ہے، جو باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جسے فرشتوں کی آمد اور وحی سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت میں اس آواز، شکل یا گفتگو کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سب خیالی چیزیں ہوتی ہیں۔

**جواب:** وحی کی یہ حقیقت قرآن وحدیث کے صریح اور واضح ارشادات کے بالکل خلاف ہے۔

پہلی بات: یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ وحی ایک غیبی فیض ہے، جس کا واسطہ فرشتہ ہوتا ہے۔

(1) وہ فرشتہ کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات دل میں ڈال دیتا ہے، جسے "القا یا الہام" کہتے ہیں جس کو حدیث میں "نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ" جبرئیل نے میرے دل میں ڈالا، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (2) کبھی فرشتے کی محض آواز سنائی دیتی ہے۔ (3) کبھی فرشتہ انسانی شکل میں سامنے آکر ہم کلام ہوتا ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے "يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ أَحْيَانًا رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي" (صحیح بخاری: 3215)

جدید تعلیم یافتہ طبقے نے وحی کی حقیقت اور ان ارشادات کا اس لیے انکار کیا کہ یہ لوگ فرشتوں، جن کے ذریعے وحی اترتی ہے، کے وجود کو ہی نہیں مانتے، حالانکہ فرشتوں کا وجود عقلی اعتبار سے ممکن ہے، صحیح دلیل نقلی بھی اس پر قائم ہے۔ جو چیز عقلا ممکن ہو اور اس کے وجود پر کوئی صحیح نقلی دلیل بھی موجود ہو تو پھر عقلی طور پر اس کا تسلیم کرنا واجب ہے۔ (دیکھیے اصول 2)۔

دوسری بات: یہ ہے کہ اگر وحی محض فکری تسلط اور خیالات کا نتیجہ ہوتی، تو اس میں صرف اصلاحی باتیں ہوتیں، لیکن قرآن کریم میں تو انبیاء کے واقعات، احکام، مستقبل کے واقعات، اور دیگر بہت سے مضامین شامل ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انسانی ذہن کی اختراع نہیں ہوسکتی۔

## دوسری غلطی: معجزات کا انکار

دوسری غلطی یہ ہے کہ متجددین معجزات کی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ جو معجزات قرآن اور احادیث میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں دور دراز کی تاویل کر کے، ان کی ایسی تشریح کی جاتی ہے کہ معجزات کے "عجیب واقعات" بالکل عام واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

جیسے "اِضۡرِبۡ بِعَصَاكَ الۡحَجَرَ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا" اے موسیٰ! اپنا عصا پتھر پر ماریے! چنانچہ اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے"۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ کی تفسیر اس طرح کردی کہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ کی طرف سفر کرو"۔ ظاہر ہے کہ یہ تفسیر بالکل باطل ہے۔

اور جہاں معجزات کو غیر عجیب اور عام واقعہ کا رنگ دینا ممکن نہ ہوا، تو وہاں انہیں نظر بندی، شعبدہ بازی یا مسمریزم (خاص طریقے سے خیالات کنٹرول کرنے) کی اقسام میں داخل کر دیا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھے میں بدل جانا، کے متعلق کہتے ہیں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا، بلکہ نظر بندی کے ذریعے لوگوں کو سانپ کی شکل دکھائی دینے لگی تھی۔

**جواب:**

1) معجزات کا انکار انہیں محال سمجھنے کی وجہ سے کیا جاتا ہے، حالانکہ معجزات محال نہیں، محض مستبعد (عجیب) اور خلاف عادت ہیں، محال اور مستبعد ایک نہیں، دونوں میں فرق ہے۔ (دیکھیے اصول 3)

2) معجزات کے انکار کی بنیاد "خلاف فطرت محال ہونے کا نظریہ" ہے، جس کی تردید انتباہ دوم میں ہو چکی۔

3) معجزات درحقیقت ایسے امور ہوتے ہیں، جو انبیاء کرام علیہم السلام سے ظاہری اور طبعی اسباب کے بغیر ظاہر ہوتے ہیں۔
تو جس قادر مطلق نے ظاہری اسباب کو، بغیر کسی اسباب کے پیدا کیا (کیونکہ اگر ہم ظاہری اسباب کی تخلیق کے لیے بھی اسباب مانیں تو ہر نتیجے پر پہنچنے کے لیے، سبب پھر اس سبب کا سبب ماننا پڑے گا، اس سے دور یا تسلسل لازم آئے گا جو کہ محال ہے) اگر وہ چاہے تو خلاف عادت امور اور ظاہری اسباب سے نکلنے والے نتائج کو بھی بلا اسباب کے پیدا کرسکتا ہے۔ اس قادر مطلق کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں۔

4) معجزات کو نظر بندی یا جادو قرار دینا غلط ہے، کیونکہ جادو تو عام انسان بھی کرسکتے ہیں، جبکہ نبی کا معجزہ چیلنج کے باوجود کوئی دوسرا پیش نہیں کرسکتا۔

## تیسری غلطی: معجزات کو دلیل نبوت نہ سمجھنا

تیسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ معجزات کو نبوت کی دلیل قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ صرف اچھی تعلیم وتربیت اور اچھے اخلاق کو نبوت کی حتمی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر کہا جاتا ہے، کہ اگر معجزات کو دلیل نبوت کہیں گے تو جادو، شعبدہ بازی اور مسمریزم کو بھی نبوت کی دلیل کہنا پڑے گا، حالانکہ وہ غیر نبی بھی سرانجام دے سکتا ہے۔

### جواب:

1) یہ دلیل فضول ہے۔ کیونکہ معجزات، شعبدہ بازی اور جادو میں بڑا فرق ہے:
معجزہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتا ہے، اسباب پر مبنی نہیں ہوتا، جبکہ جادو شیطان کی مدد سے مخفی اسباب کے تحت ہوتا ہے...... معجزہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے، جبکہ جادو فاسق وفاجر اور کافر کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے...... معجزے کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، جادوگر اور بڑے بڑے ماہرین ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز و بے بس نظر آتے ہیں۔ جبکہ جادو اور شعبدہ بازی کا مقابلہ ماہرین فن کرسکتے ہیں۔

2) اگر معجزات نبوت کی کوئی دلیل نہ ہوتے تو کفار انبیاء کرام علیہم السلام سے بار بار

معجزات طلب نہ کرتے۔

باقی اچھی تعلیم وتربیت اور اچھے اخلاق بھی، یقیناً نبی کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں، کیونکہ حضرات انبیاء کرام اخلاق کریمانہ میں اس قدر بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں، کہ کوئی بھی ان کے اخلاق عالیہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن چونکہ انبیاء کرام کے مخاطب دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

1) ایک خواص اور اچھے عقل وشعور کے مالک لوگ۔

2) اور دوسرے عام یا ہٹ دھرم انسان۔

تو نبوت کی بھی دو دلیلیں ہیں:

اول: علمی دلیل: اچھی تعلیم وتربیت اور اچھے اخلاق دوم: عملی دلیل: معجزات

حکمت خداوندی کے تحت پہلی قسم کے افراد کو حضرات انبیاء نے تعلیم واخلاق کے ذریعے رسالت کی حقانیت اور حقیقت سمجھائی۔ جبکہ دوسری قسم کے لوگوں کو معجزات دکھائے گئے تاکہ انکار کرنے کی کوئی حجت ان کے پاس نہ رہے۔ اس لیے معجزات، اچھی تعلیم وتربیت اور اچھے اخلاق میں سے کسی ایک کے بھی دلیل نبوت ہونے سے انکار کرنا درست نہیں۔

## چوتھی غلطی: احکام نبوت کو صرف آخرت سے متعلق خاص سمجھنا

نبوت کے بارے میں چوتھی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ بعض لوگ نبوت کے احکام کو صرف دینی اور اخروی امور تک محدود سمجھتے ہیں اور دنیاوی معاملات میں خود کو آزاد سمجھتے ہیں۔ ان کے بقول انبیاء کرام علیہم السلام کو صرف دین کے معاملات میں ہی ہدایت دینے کا حق تھا، جب کہ اپنے دنیاوی امور میں لوگ آزاد ہیں۔

**جواب:** یہ خیال بالکل غلط ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "عبادات، معاشرت، معیشت، سیاست" سمیت، تمام دینی، دنیاوی امور اور زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق انسانوں کو ہدایات دی ہیں۔ قرآن وحدیث کی قطعی نصوص بھی واضح طور پر متجددین کے اس نظریے کی تکذیب کرتی ہیں۔

ارشاد ربانی ہے: "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ" (الاحزاب: 36) کسی بھی مومن مرد اور

کسی بھی مومن عورت کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی کام سے متعلق کوئی فیصلہ سنا دیں تو ان کا کوئی اختیار باقی ہو۔

یہ آیت کریمہ ایک دنیاوی اور معاشرتی معاملے کے پس منظر میں نازل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے واضح فرمادیا ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بھی معاملے میں، چاہے دینی ہو یا دنیاوی، کوئی حکم فرمادیں تو کسی کو اس میں اختیار نہیں رہتا۔

## اشکال:

"تابیر نخل" (کھجور کے درختوں کو قلم لگانے کے تذکرے پر مشتمل) والی روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیاوی معاملات میں لوگوں کو آزاد و خودمختار چھوڑ دیا ہے۔

چنانچہ "تابیر نخل" والی روایت کی تفصیل یہ ہے کہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت کے پاس سے گزرے، جو کھجور کے درختوں کو تابیر یعنی قلم (نر کو مادہ کے ساتھ جوڑ کر) لگا رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَو لَم تَفعَلُو الَصلُحَ" اگر تم اس طرح نہ کرو تو بہتر ہوگا (آپ کے فرمان کے مطابق لوگوں نے قلم لگانا چھوڑ دیا) تو کھجور خراب آئی۔

راوی حدیث کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس طرف سے گزرے تو آپ نے فرمایا: تمہارے درختوں کو کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ایسے ایسے فرمایا تھا (یعنی قلم لگانے سے منع فرمایا تھا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَنتُم اَعلَمُ بِاَمرِ دُنیَاکُم" تم لوگ اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ (صحیح مسلم: 6128)

اس حدیث پاک سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی معاملات کے بارے میں لوگوں کو آزاد و خودمختار چھوڑ دیا ہے۔

## جواب:

(1)......حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یہی تو فرمایا ہے: اَنتُم اَعلَمُ بِاَمرِ دُنیَاکُم کہ تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ تم دنیاوی امور میں خودمختار بھی ہو کہ جو چاہو کرو۔ ثبوت علم سے ثبوت اختیار کیسے لازم آیا؟

(2)......اس حدیث کا تعلق ان دنیاوی امور سے ہے، جن کے بارے میں شریعت نے باقاعدہ کوئی حکم نہ دیا ہو، صرف مشورہ دیا ہو یا خاموشی اختیار کی۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شریعت کی طرف سے جو بات بطور حکم کے کی جائے، اس میں بھی کوئی اختیار ہے۔ کیونکہ دیگر نصوص میں ایسے اختیار کی نفی صراحتاً مذکور ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں۔

بات سمجھنے کے لیے اس کی عقلی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے عارضی حکمران ہمارے ذاتی معاملات میں بھی دخل اندازی کرتے رہتے ہیں اور ہم ان کا یہ حق تسلیم بھی کرتے ہیں، تو کیا مالک حقیقی اور پیغمبر خدا کو یہ حق حاصل نہیں ہے؟

## پانچویں غلطی: احکام شریعت کو ہر زمانے میں قابل تبدیل سمجھنا

چوتھی غلطی کے نتیجے میں ایک پانچویں غلطی یہ کی جاتی ہے کہ شریعت کے جو احکام انسانوں کے آپس کے معاملات کے بارے میں ہیں، ان کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایسے احکام ہر زمانے میں تبدیل ہوجاتے ہیں، لہٰذا ان کا اتباع ضروری نہیں۔

**جواب:** اگر یہ احکام بذات خود مقصود نہ ہوتے، پھر تو یہ سمجھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا، لیکن چوتھی غلطی کے ضمن میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ دنیاوی معاملات میں بھی دین کی ہدایات بذات خود مقصود ہیں، اس لیے اس تبدیلی کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

**عقلی شبہ 1:** جب زمانے کے بدلنے سے انسانوں کی مصلحتیں بھی بدل جاتی ہیں، اور اسی وجہ سے پہلی شریعتیں منسوخ ہوتی رہی ہیں، انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعتوں میں بھی فرق آیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے تک چھ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ اس مدت میں مصلحتیں تبدیل ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک نئی شریعت دے کر مبعوث کیا گیا، اب چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد کیا انسانوں کی مصلحتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟

**جواب:** جب شریعت عطا کرنے والی ذات سو فیصد "کامل حکمت والی اور عالم الغیب" ہے تو اس کے لیے یہ بالکل آسان اور ممکن ہے کہ وہ ایسے قوانین بنا دے جن میں قیامت تک کے زمانوں

اورانسانی معاشروں کی مصلحتوں کا ہر اعتبار سے احاطہ کیا گیا ہو۔یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدیہ قیامت تک کے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہے،اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالی کا علم تمام زمانوں اور حالات کو شامل اور محیط ہے۔

**عقلی شبہ 2:** متجد دین کہتے ہیں کہ ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے دنیاوی معاملات میں تنگی پیش آتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے احکامات شاید اس زمانے کے مطابق نہیں ہیں؟

**جواب:** یہ بات اس وقت صحیح ہوسکتی تھی، جب سب شریعت پر عمل کررہے ہوتے، اور پھر کاموں میں رکاوٹ اور دشواری پیش آرہی ہوتی حالانکہ یہ کوئی ثابت نہیں کرسکتا۔اصل بات یہ ہے کہ شریعت پر عمل کرنے والے کم ہیں اور عمل نہ کرنے والے زیادہ۔ان عمل کرنے والوں کی تھوڑی تعداد کو جب عمل نہ کرنے والوں کی زیادہ تعداد سے واسطہ پڑے گا تو لازمی بات ہے کہ معاملات میں تنگی پیش آئے گی۔تو تنگی پیش آنے کی وجہ لوگوں کی اکثریت کا شریعت پر عمل نہ کرنا ہے، نہ کہ خود شریعت کے احکام۔جیسے:

اگر کوئی ڈاکٹر مریض کو علاج کے سلسلے میں کچھ چیزیں کھانے کی تجویز کرے، مگر مریض کے گاؤں میں ان میں سے ایک بھی دستیاب نہ ہو تو اس کا سبب "ڈاکٹری" نہیں، بلکہ مریض کے گاؤں کی تجارت ہوگی، کہ ضرورت کی چیزیں بھی دستیاب نہیں۔

رہا یہ کہ احکام شریعت کی وجہ سے بعض دفعہ کسی کا ذاتی مفاد متاثر ہوتا ہے، تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ایسا کون سا قانون ہے جس میں عوام کے مجموعی مفاد کی مصلحت کی رعایت کی وجہ سے، بسا اوقات فرد کے ذاتی مفاد متاثر نہ ہوتے ہوں؟ ایک اچھا قانون اسے ہی سمجھا جاتا ہے جس میں انفرادی مفاد کے بجائے عوام کے اجتماعی مفاد کو ترجیح دی گئی ہو۔

## چھٹی غلطی: احکام شریعت کی من گھڑت حکمتیں تراشنا

چھٹی غلطی یہ ہے کہ بعض افراد شرعی احکام کی علتیں اپنے ذہن سے تراش کر احکام کو ان من گھڑت علتوں پر موقوف سمجھتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن وحدیث میں مذکور واضح احکام میں اپنی من گھڑت علتوں کی بنیاد پر، تبدیلی اور تحریف کرتے رہتے ہیں، مثلاً:

بعض لوگوں نے وضو کی علت صرف "جسم کی ظاہری صفائی" کو سمجھا اور جب نماز کے

وقت انہوں نے محسوس کیا کہ وہ تو پہلے سے ہی صاف ستھرے ہیں تو انہوں نے وضو کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور بے وضو نماز شروع کر دی۔ بعض لوگوں نے سمجھا کہ نماز سے مقصود اخلاق کی تہذیب ہے، ہمارے اخلاق اچھے ہیں تو ہمیں نماز کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح روزہ، زکوۃ، حج، سود اور دیگر احکام شریعت میں دخل اندازی کر کے پوری شریعت کو کالعدم کر دیا۔

جواب: 1) یہ طرز عمل الحاد اور بالکل غلط ہے، اس لیے کہ شریعت نے بہت سارے احکام کو بندوں کا امتحان لینے کے لیے، محض بطور عبادت فرض کیا ہے، اگرچہ ان میں کوئی عقلی وجہ اور علت نظر نہ بھی آئے۔

2) جن چیزوں کو احکام کی علت قرار دیا جاتا ہے اس بات کی کیا دلیل ہے، کہ حقیقت میں بھی یہی علتیں ہوں؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ علت وہ اثرات ہوں جو ان احکام پر عمل کرنے سے ہی حاصل ہوتے ہوں، جیسا کہ بعض دواؤں کے خاص خاص اثرات ہوتے ہیں۔

3) اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی حکم کی علت ایک آدمی کی سمجھ میں کچھ ہو، جبکہ دوسرے آدمی کی نظر میں کوئی اور ہو، تو ایک کی نکالی گئی علت کو دوسرے کی علت پر ترجیح کس بنیاد پر دی جائے گی؟

جب ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں تو "إِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا" کے تحت دونوں کی علتیں کالعدم ہو جائیں گی۔ علت کے کالعدم ہونے سے خود حکم ہی کالعدم شمار ہوگا۔ کیا کوئی عقل مند مسلمان اس کا قائل ہوسکتا ہے؟

4) اس میں ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ علتیں محض اندازے پر مبنی ہوتی ہیں، اگر ان میں کوئی نقص نکل آئے تو اصل حکم ناقص ٹھہرتا ہے۔ اس طرح تو مخالفین اسلام کو ہمیشہ کے لیے احکام شریعت کو باطل قرار دینے کا موقع مہیا کرنا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ "قوانین الٰہیہ" ہیں، قوانین میں علتیں نہیں ڈھونڈی جاتیں، نہ من گھڑت علتوں کی بنا پر قانون تبدیل کیا جاتا ہے، بلکہ قانون کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔ قانون بنانے والے کے علاوہ کسی اور کو قانون میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

اشکال: اگر علتیں نکالنے میں خرابیاں ہیں، جس سے احکام اسلام برباد ہونے کا اندیشہ ہے تو فقہا اور مجتہدین نے بہت سے احکام کی ازخود علتیں کیوں نکالیں؟

**جواب:** مجتہدین نے بعض احکام میں جو علتیں نکالی ہیں، تو اس کی دو وجوہات ہیں:

1) دینی ضرورت۔ تاکہ جن چیزوں اور امور کے بارے میں قرآن و حدیث میں وضاحت نہیں، قطعی نصوص سے ثابت شدہ حکم کی علت کی روشنی میں، ان کا حکم معلوم کیا جائے۔

2) دوسری بات یہ کہ مجتہدین میں کمال علم کے ساتھ، اس کام کا سلیقہ، صلاحیت اور مہارت بھی تھی۔ آج کل نفس پرستی بھی بڑھ چکی ہے اور یہ دونوں باتیں بھی مفقود ہیں۔ تو پھر کیسے علتیں نکالنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

## ساتویں غلطی: منکرِ نبوت کی نجات کا قائل ہونا

ساتویں غلطی جو سب سے بدترین ہے،، وہ یہ کہ انسانیت کے کچھ دعویدار منکر نبوت کی نجات کے قائل ہیں۔ بقول ان کے کہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد عقیدہ توحید کی اصلاح تھی، لہٰذا اگر کوئی توحید کا قائل ہو تو "اصل مقصد توحید حاصل ہونے کی وجہ سے" وہ نجات پائے گا، اگرچہ انبیاء کی نبوت کو وہ نہ مانتا ہو۔

**جواب:** 1)۔ نقلی اعتبار سے اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن وسنت میں نبوت کا انکار کرنے والوں کو پکا کافر اور ہمیشہ کے لیے جہنمی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُواْ بَيْنَ اللهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُواْ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلاً۔ أُوْلَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقّاً وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَاباً مُّهِيناً۔ (النساء:150۔151)

"بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض (رسولوں) پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان راستہ اختیار کریں یہی لوگ پکے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

2) عقلی لحاظ سے بھی رسول خدا کا منکر جہنمی ہے۔

کیونکہ جو شخص نبوت کا انکاری ہے، وہ دراصل اللہ تعالی کے فرمان: "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ" اور اس جیسی دوسری قرآنی آیات کا انکاری ہے۔ اور یہ ناقابل معافی جرم ہے۔

3) عرفی طور پر بھی نبوت کا انکار نا قابل معافی جرم قرار پاتا ہے۔
مثلاً: اگر کوئی شخص بادشاہ کو تو مانے مگر اس کے بنائے گئے گورنر اور وزیر کو تسلیم کرنے کے بجائے، ہمیشہ اس کی مخالفت کرے، تو کیا وہ شخص بادشاہ کے نزدیک کسی مقام و مرتبہ کے یا معافی کے لائق ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ بادشاہ ایسے شخص کو اپنے قریب کرنے کے بجائے برسرِ عام سزا دے گا۔ بعینہ اسی طرح رب کائنات اپنے محبوب کے دشمنوں کو آخرت میں نا قابل معافی سزا دے گا۔
خلاصہ یہ کہ منکر نبوت ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا، کیونکہ نبوت پر ایمان لانا اسلام کا بنیادی رکن ہے اور نبوت کا انکار پورے دین کا انکار ہے۔

## چوتھا انتباہ: قرآن کریم سے متعلق غلط فہمیاں

شریعت کی بنیاد چار اصولوں پر ہے: قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس شرعی جو مخصوص شرائط کے مطابق ہو۔ لیکن ان سب کے متعلق کئی غلطیاں کی جارہی ہیں۔ قرآن کریم سے متعلق دو بنیادی غلطیاں کی جارہی ہیں:

### پہلی غلطی: احکام شریعت کو صرف قرآن کریم میں منحصر سمجھنا

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام شرعی احکام صرف قرآن کریم میں ہیں۔ شریعت کے باقی اصولوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیگر اصول شریعت "حدیث، اجماع اور قیاس" کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر حکم براہ راست قرآن کریم سے دکھانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔
چنانچہ بعض لوگوں کو جب کسی گناہ سے روکا جاتا ہے تو فوراً سوال کرتے ہیں کہ "یہ قرآن کریم میں کہاں لکھا ہے؟" مثلاً: داڑھی منڈوانے سے روکا جائے، تو کہا جاتا ہے کہ "اگر داڑھی کاٹنا منع ہے، تو دکھاؤ قرآن کریم میں اس کی ممانعت کہاں لکھی ہے؟"
یہ سوچ اتنی عام ہوگئی ہے کہ اگر کوئی مذہب مخالف شخص کسی بات کے قرآن سے ثبوت کا مطالبہ کرے، تو بعض لوگ فوراً کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح وہ بات قرآن ہی سے ثابت ہو جائے، اگرچہ فاسد تاویل ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ جو خود تلاش کرنے پر قادر نہیں ہوتے وہ علماء

کو مجبور کرتے ہیں کہ کسی بھی طرح قرآن کریم سے ثابت کر کے دیں۔

## پہلی غلطی کی تردید:

"ہر حکم براہ راست قرآن کریم سے دکھانے کا مطالبہ کرنا" منطقی اور علمی لحاظ سے درست نہیں، کیونکہ قرآن کریم کے علاوہ "حدیث، اجماع اور قیاس شرعی" بھی دین کے بنیادی اصول ہیں، جن کی حجیت اپنے اپنے موقع پر خود قرآن سے ثابت ہے۔ جب استدلال اور دلیل کا صرف قرآن کریم میں منحصر ہونے کا دعوی ہی غلط ہے، تو صرف قرآن ہی سے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ بھی درست نہیں۔

## غلطی کے نتائج:

اگر احکام شریعت کو صرف قرآن میں منحصر سمجھا جائے اور باقی اصول شرعیہ کا انکار کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دین کا بیشتر حصہ کالعدم ہو جائے گا، اس لئے کہ بہت سارے احکام ایسے ہیں، جن کی تفصیل قرآن کریم میں موجود نہیں ہے۔ کیا کوئی شخص پانچ نمازوں کی رکعات کی تعداد کو قرآن سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص زکوۃ کا نصاب اور مقدار قرآن کریم سے دکھا سکتا ہے؟ اس طرح کئی دیگر احکام ہیں، جن کی تفصیل قرآن کریم میں مذکور نہیں۔ اس لیے یہ مطالبہ غیر معقول ہے۔

## حسی مثال سے غلطی کی تردید:

اگر کوئی شخص عدالت میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے گواہ پیش کرے تو فریق مخالف کو قانونی جرح کا حق تو حاصل ہے، لیکن اگر گواہ جرح میں سچا ثابت ہو تو فریق مخالف کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدالت سے یہ درخواست کرے کہ اگرچہ گواہ تو معتبر ہیں، مگر میں اس دعوے کو تب تسلیم کروں گا، جب اس گواہ کے بجائے فلاں سردار یا عہدے دار گواہی دے! ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ بے بنیاد ہوگا۔ اور کوئی عدالت اس کو تسلیم نہیں کرے گی۔

## من پسند دلیل کا مطالبہ درست نہیں:

یہی وجہ ہے کہ علمِ مناظرہ (دلائل کی بحث) میں یہ اصول مقرر ہے کہ "مدعی

(دعویٰ کرنے والے) سے نفس دلیل کا مطالبہ تو درست ہے، لیکن کسی کو یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں کہ صرف فلاں خاص دلیل سے دعوی ثابت کرو۔

اسی طرح جو شخص یہ دعوی کرے کہ "فلاں حکم" شریعت سے ثابت ہے، اس کو اختیار ہے کہ شریعت کے جس اصول سے چاہے اسے ثابت کرے۔ صرف قرآن کریم کی آیت پیش کرنے کا اصرار کرنا قطعاً غلط ہے۔ اس لیے کہ مدعی کے حق میں مطلق دلیل کافی ہے۔ من پسند خاص دلیل کا مطالبہ کرنا اصول کے خلاف ہے۔

## ظنی احکام کا ماننا بھی لازم ہے:

ہاں یہ حقیقت ہے کہ چاروں دلائل (قرآن، حدیث، اجماع، قیاس) قوت میں برابر نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے ثابت ہونے والے احکام کی قوت میں بھی فرق ہے کہ بعض احکام قطعی جبکہ بعض احکام ظنی ہوتے ہیں، لیکن یہ اختیار کسی کو حاصل نہیں کہ وہ ظنی احکام کو نہ مانے۔ کیا چیف جسٹس کے بہت سارے فیصلے اسی طرح جاری نہیں ہوتے، کہ وہ اپنے اجتہاد اور ظن سے کسی پیش آمدہ مقدمے کو کسی قانونی دفعہ کے تحت داخل کر دیتا ہے، وہ دفعہ اگرچہ یقینی ہوتی ہے، لیکن مقدمے کا اس کے تحت داخل ہونا ظنی ہوتا ہے۔ کیا اس بنیاد پر جج کے کسی فیصلے کا کوئی انکار کرتا ہے؟ انکار کی صورت میں جو نتیجہ ہوسکتا ہے، اس کو ہر شخص جانتا ہے۔

## دوسری غلطی: قرآن کریم کے ساتھ سائنس کے انطباق میں غلو

دوسری غلطی یہ ہے کہ قرآن کریم کو زبردستی سائنسی تحقیقات پر مشتمل کرنے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر سائنسی تحقیق پہلے ہی سے قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس لیے جب یورپ والوں کی کوئی سائنسی تحقیق دیکھی یا سنی، جس طرح بھی ہوسکا، اسے کسی آیت سے ثابت کر دیا۔ پھر اسے اسلام کی بڑی خیر خواہی اور قرآن کریم کا بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس غلطی میں بعض اہل علم بھی مبتلا ہیں۔

## دوسری غلطی کی تردید:

اس طرز عمل میں چار طرح کی خرابیاں پائی جاتی ہیں:

## پہلی خرابی: سائنس کے مسائل پر مشتمل ہونے کو قرآن کریم کا کمال سمجھنا

یہ تصور ہی غلط ہے کہ قرآن کا کمال (عظمت) اس بات میں ہے کہ اس میں سائنس کے تمام مسائل کا ذکر ہو۔

وجہ اس غلط فہمی کی یہ ہے کہ قرآن کریم کے اصل موضوع کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ قرآن کریم اصل میں نہ سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی تاریخ اور جغرافیہ کی، بلکہ یہ انسانوں کو صحیح راستے پر چلانے اور روحوں کی اصلاح کے لیے نازل شدہ کتاب ہے۔ جیسے میڈیکل کی کسی کتاب کا کپڑا بنانے اور جوتا بنانے کے طریقوں سے خالی ہونا، اس کے لیے عیب کی بات نہیں، بلکہ بغیر ضرورت کے ان باتوں پر مشتمل ہونا موضوع سے ہٹنے کی وجہ سے ایک لحاظ سے عیب اور ان سے خالی ہونا کمال ہے۔ اسی طرح، قرآن کریم چونکہ روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے آیا ہے، تو قرآن کریم کا غیر ضروری سائنسی تفصیلات سے خالی ہونا، اس کے لیے کوئی خامی نہیں، بلکہ ایک لحاظ سے اس کے کمال کی علامت ہے۔

## سائنس بہ قدر ضرورت:

البتہ جہاں اپنے موضوع (اصلاح ارواح، جس کے لیے عظیم پیش خیمہ توحید ہے) کو ثابت کرنے کی ضرورت پڑی، وہاں قرآن کریم نے مختصر انداز میں، زمین و آسمان، جن وانس، حیوانات و نباتات اور کائنات کی مختلف چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے، مگر ان کا ذکر کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ توحید اور عقیدہ آخرت پر استدلال کے لیے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ تفصیل کی ضرورت نہیں تھی اس لیے تفصیلی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

## دوسری خرابی: قرآن کریم کے دلائل کا ناقص اور غیر واضح ہونا

عام قاعدہ ہے کہ دلیل پیش کرتے ہوئے دلیل کے اجزا ایسے منتخب کیے جاتے ہیں جو مخاطب کے نزدیک تسلیم شدہ ہوں یا بالکل واضح ہوں یا دلیل کے ساتھ تسلیم کرا دیے گئے ہوں ورنہ ان کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب سمجھنا چاہیے کہ قرآن کے سب سے پہلے مخاطب اہل عرب تھے۔ سائنسی تحقیقات ان کے لیے غیر واضح، غیر ثابت شدہ اور غیر تسلیم شدہ تھیں، کیونکہ وہ ان سے بالکل ناآشنا تھے۔ اگر قرآن کریم کو زبردستی سائنسی تحقیقات

کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی جائے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کریم اپنے سب سے پہلے مخاطب لوگوں کے لیے، ایسی غیر واضح دلیلیں دیتا رہا، جو اس وقت کے لوگوں کے لیے ناقابل فہم تھیں، تو خود سوچیے کہ یہ کلام اللہ کے طرز استدلال پر کتنا بڑا دھبہ ہے؟

## تیسری خرابی: قرآن کریم پر اعتراض کے مواقع مہیا کرنا

سائنسی تحقیقات غلط بھی ہوتی رہتی ہیں اور سائنس کے نظریات اکثر بدلتے بھی رہتے ہیں۔ اگر آج کوئی نظریہ قرآن کریم کی کسی آیت کے مطابق ثابت کیا جائے، اور کل وہی نظریہ غلط ثابت ہو جائے، تو ایک ادنی ملحد بھی نہایت آسانی سے قرآن پر اعتراض کرتے ہوئے، قرآن کو جھٹلا سکے گا کہ قرآن کی یہ بات غلط ہے، اور جز کے غلط ہونے سے کل کا غلط ہونا لازم آتا ہے، لہذا پورا قرآن غلط ہے۔ ذرا سوچیے اس وقت کتنی مشکل پیش آئے گی؟

**شبہ:**

قرآن کریم میں یہ خاصیت ہے کہ ہر دور کی نئی تحقیق کے مطابق اس کی آیات کا مطلب بدلتا رہتا ہے، جس زمانے میں جو بات ثابت ہو قرآن کریم کے الفاظ اس کے مناسب اور مطابق ہو جاتے ہیں۔

**جواب:**

اس صورت میں تو یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی مفہوم بھی قابل اعتبار نہ ہو، کیونکہ ہر مفہوم میں اس کے مخالف کا بھی احتمال موجود ہوگا۔ یہ تو وہی بات ہوگئی، جیسے کسی چالاک نجومی کا قصہ ہے۔ اس سے جب پوچھا جاتا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ تو کہہ دیتا "لڑکا نا لڑکی" یعنی ایسا اسلوب اختیار کرتا، جس میں دونوں باتوں کا احتمال ہوتا۔ پھر جو بھی واقعہ پیش آتا، تو یہ لہجے کے اختلاف سے اپنی پیشین گوئی کو اس پر فٹ کر دیتا۔

مثلاً: اگر لڑکا پیدا ہوتا تو کہتا: دیکھو! میں نے کہا تھا نا کہ "لڑکا!!! نا لڑکی"۔ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو کہتا: دیکھو! میں نے کہا تھا نا کہ "لڑکا، نا!!! لڑکی"۔ اگر اس طرح کے احتمالات قرآن کریم میں بھی مانے جائیں تو پھر یہ کتاب ہدایت تو نہ ہوئی۔

### چوتھی خرابی: غیرت ایمانی کے خلاف ہونا

سائنسی تحقیقات کے ساتھ آیات قرآنی کو منطبق کرنا غیرت ایمانی کے بھی خلاف ہے۔ مثلاً: اگر یورپ کے محققین یہ کہنے لگیں کہ دیکھو! قرآن کو نازل ہوئے اتنا زمانہ ہو چکا ہے، مگر آج تک کسی نے حتیٰ کہ خود تمہارے نبی نے بھی قرآن کا صحیح مطلب نہیں سمجھا، ہمارا احسان مانو کہ! ہماری سائنسی تحقیقات کی وجہ سے تمہیں قرآن کا صحیح مطلب سمجھ میں آیا، تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

## پانچواں انتباہ: احادیث سے متعلق غلط فہمیاں

اسلامی تعلیمات اور راہنمائی کا اہم ذریعہ قرآن اور حدیث ہیں۔ جہاں قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، وہیں حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی اور اقوال پر مبنی ہے۔ ان دونوں کا تعلق مسلمانوں کے لیے نہایت اہم ہے، اور ان کی اتباع کرنا ایمان کا جزو ہے۔ تاہم بعض لوگ احادیث کی حجیت کے حوالے سے مختلف غلط فہمیوں کا شکار ہیں، اور احادیث کے محفوظ ہونے کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

### پہلی غلطی: احادیث کو غیر محفوظ کہنا اور حجت نہ سمجھنا

بعض لوگ کہتے ہیں کہ: ”احادیث نہ لفظاً محفوظ ہیں اور نہ معناً“۔ لفظاً اس لیے محفوظ نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں احادیث لکھ کر جمع نہیں کی گئیں، صرف زبانی نقل در نقل کی عادت تھی، تو ایسا مضبوط حافظہ، کہ الفاظ تک یاد رہیں، فطرت کے خلاف ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احادیث کے الفاظ محفوظ نہیں ہیں۔

”معناً“ اس لیے محفوظ نہیں کہ جب صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ سنا، تو ضرور اس کا کوئی نہ کوئی مطلب بھی سمجھا ہوگا، چاہے وہ مطلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اور چونکہ الفاظ لکھ کر محفوظ نہیں کیے تھے، تو ہر ایک نے اسی اپنے سمجھے ہوئے مفہوم کو دوسروں کے سامنے بیان کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصل مراد اور معانی کا محفوظ رہنا بھی یقینی نہیں ہے۔

تو جب احادیث کے نہ الفاظ محفوظ ہیں، نہ معانی، تو احادیث کس طرح حجت

ہوئیں؟ نام نہاد "فرقہ قرآنیہ" جو صرف قرآن کو حجت ماننے کے مدعی ہیں اور احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے اعتراض کا خلاصہ بھی یہی ہے۔

## غلطی کی تردید:

حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمیاں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ لوگوں نے محدثین کے حالات میں غور نہیں کیا۔ انہوں نے محدثین کو اپنی طرح، حافظے اور احادیث کی رغبت وشوق اور خشیت میں کمزور سمجھ لیا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ احادیث "لفظاً" اور "معناً" ہر طرح محفوظ ہیں۔

## پہلا ثبوت: محدثین کا غیر معمولی حافظہ

محدثین کا حافظہ غیر معمولی تھا، اس پر بے شمار واقعات گواہ ہیں، جو تواتر کے ساتھ منقول ہیں، جنہیں جھٹلانا ممکن نہیں۔ چند واقعات اشارتاً پیش خدمت ہیں:

1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا سو شعر پر مشتمل ایک لمبا قصیدہ صرف ایک بار سن کر یاد کر لینا۔

2) امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک ہی مجلس میں خلط ملط متن اور سند والی سو احادیث کو سن کر ہر ایک کو غلط قرار دینا، پھر ان سب کو بعینہ اسی طرح غلط سنا کر ہر ایک کو صحیح کر کے سنانا۔

3) امام ترمذی رحمہ اللہ کا نابینا ہو جانے کے بعد ایک جگہ گزرتے وقت سر جھکا لینا، اور وجہ دریافت کرنے پر وہاں درخت ہونے کا بتانا، حالانکہ اس وقت وہاں کچھ نہیں تھا۔ اور تحقیق کے بعد اس کا درست ثابت ہونا۔

4) محدثین کا اپنے شیوخ کے امتحان کے لیے وقتاً فوقتاً احادیث دوبارہ سننا اور ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہ پانا۔

یہ سب واقعات تاریخ اور اسماء الرجال کی کتابوں میں مذکور ہیں، جو محدثین کی قوت حافظہ کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

## دوسرا ثبوت: نصرت الٰہی

قوت حافظہ کے علاوہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کام لینا تھا، اس لیے غیبی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی خصوصی مدد ونصرت کی گئی۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں موجود تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کون اپنی چادر پھیلائے گا، یہاں تک کہ میں اپنی بات پوری کرلوں اور پھر وہ اپنی چادر سمیٹ لے اور اس کے بعد کبھی مجھ سے سنی ہوئی بات نہ بھولے؟ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے جسم پر موجود چادر اتار کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پھیلا دی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پوری ہونے کے بعد وہ چادر اپنے سینے سے لگالی، جس کے بعد ان کا حافظہ ایسا مضبوط ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی کوئی حدیث بھی نہیں بھولتے تھے۔ (صحیح بخاری:7354)

**اعتراض:**

یہاں خود حدیث کے حجت ہونے پر بحث ہورہی ہے، پھر اس کو ثابت کرنے کے لیے دلیل بھی حدیث سے دی جارہی ہے، یہ تو درست نہیں؟

**جواب:**

بحث احکام کی احادیث کے متعلق ہورہی ہے، جبکہ ہماری پیش کردہ حدیث کا تعلق ایک تاریخی واقعے سے ہے، جو بلا اختلاف حجت ہے۔ گویا حجیت حدیث کو، حدیث سے نہیں بلکہ تاریخ سے ثابت کیا جارہا ہے۔ جس پر اعتراض کی گنجائش نہیں۔

**اعتراض:**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ "خلافِ فطرت" ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض چادر کو سینے کے ساتھ لگانے سے، حافظہ مضبوط ہوگیا؟

**جواب:**

1) یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا، معجزات فطری اور طبعی قوانین سے ماورا ہوتے ہیں۔ انتباہ سوم بحث معجزات میں اس کی تفصیل کی جاچکی ہے۔

2) اس واقعے کا خلاف فطرت ہونا ہمیں تسلیم نہیں، کیونکہ اس کی نظیر فطرت کے موافق واقعات میں بھی ملتی ہے۔

جیسا کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ مسمریزم کے ماہرین لوگوں کے ذہن پر ایسا اثر ڈال دیتے ہیں کہ غائب چیزیں نظر آنے لگتی ہیں اور موجود چیزیں غائب ہوجاتی ہیں۔ جب آج کے دور

میں مسمریزم کے ذریعے ذہن پر اثر ڈالا جا سکتا ہے، تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعا کے اثر سے کیوں انکار کیا جائے؟

یہاں "مسمریزم" کی نظیر ذکر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ عمل بھی اسی طرح تھا، بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر غیر معمولی بات کو مطلقاً خلافِ فطرت کہنا درست نہیں۔

## تیسرا ثبوت: حفاظت احادیث سے متعلق اسلاف کا شوق اور خشیت

احادیث کے راویوں میں حافظے کی قوت کے علاوہ شوق اور خشیت بھی اعلیٰ درجے کی موجود تھی۔ شوق اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے احادیث یاد کرنے اور آگے پہنچانے والے کے لیے دعا فرمائی: "نَضَّرَ اللهُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا" (ابن ماجه:3056۔ مجمع الزوائد:1 / 137) کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش وخرم رکھے، جو میری بات سنے، اس کی حفاظت کرے، اسے یاد رکھے، اور جیسے سنے ویسے ہی آگے پہنچا دے"۔ اس دعا کے پیش نظر محدثین پوری کوشش و احتیاط کرتے کہ بغیر کسی ردوبدل کے بعینہ حدیث آگے پہنچائیں۔

احادیث میں ردوبدل کرنے سے ڈر اور خشیت اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" (صحیح بخاری:110) جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا، اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے"۔ حتیٰ کہ بعض صحابہ اس ڈر اور خشیت کی وجہ سے کہ "کہیں کوئی لفظ ادھر اُدھر نہ ہو جائے" حدیث بیان ہی نہیں فرماتے تھے۔

## چوتھا ثبوت: محدثین کی کمال احتیاط

محدثین کا یہ انداز بھی اہتمام حفظ اور احتیاط کی واضح دلیل ہے کہ احادیث کے بعض اجزا کو مختلف الفاظ سے بیان کرتے ہیں اور احتیاط کے طور پر "نَحْوَهُ" "وَغَيْرَ ذٰلِكَ" یا "أَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ" کے الفاظ ذکر کرتے ہیں، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف جھوٹی نسبت بھی لازم نہ آئے اور آپ کا ارشاد بھی آگے روایت کیا جائے۔

## عہد نبوی میں تدوین احادیث نہ ہونا، استناد احادیث میں خلل انداز نہیں

اس صورتحال کے سامنے آنے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ ابتدائی زمانے میں احادیث کا باقاعدہ کتابی صورت میں نہ لکھا جانا، ان کی حفاظت کے اعتبار سے بالکل نقصان دہ نہیں تھا، بلکہ غور کرنے سے مفید اور مددگار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لکھے ہوئے پر اعتماد کرنے سے حافظے کا استعمال کم ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں حافظہ کمزور ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ "ہر قوت ریاضت اور مشق سے بڑھتی ہے"۔ چنانچہ ہم نے ان پڑھ لوگوں کو پرانے پرانے حساب کتاب زبانی سناتے ہوئے دیکھا ہے، جبکہ ہمیشہ لکھنے پر انحصار کرنے والوں کو بغیر لکھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

دوسری بات وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ محدثین کی جماعت سے چونکہ اللہ تعالی کو یہ کام لینا تھا، اسی وجہ سے انہیں حافظہ بھی کمال کا عطا فرمایا۔ اب جب کہ احادیث کی تدوین اور احکام کی جمع وترتیب کا کام ہوگیا تو ضرورت پوری ہوگئی، ویسے حافظے بھی نہ رہے۔ یہ فطری بات ہے کہ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے مناسب صلاحیتیں اور قوتیں پیدا کردی جاتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں ٹیکنالوجی اور ایجادات کی مناسبت سے دماغوں کا پیدا ہونا، اس فطری قانون کی تائید کرتا ہے (کہ تمدن کی ترقی ایسے ہی دماغوں کی مقتضی ہے)

### سوال:

ابتدائے اسلام میں احادیث نہ لکھنے اور بعد میں لکھنے لکھوانے کی کیا وجوہات تھیں؟

### جواب:

ابتدائے اسلام میں احادیث نہ لکھنے اور اس سے رکنے کا حکم مخصوص حالات کے تحت تھا، یعنی: "احادیث کو قرآن کریم کے ساتھ خلط ملط ہونے سے بچانا، تاکہ قرآن کریم اور احادیث آپس میں خلط ملط نہ ہوجائیں"۔

پھر جب قرآن کریم کی حفاظت کا اہتمام مکمل ہوگیا، خلط ملط ہونے کا اندیشہ ختم ہوگیا اور مختلف فرقے وجود میں آنے لگے تو احادیث کو نہایت احتیاط سے مدون کیا گیا، تاکہ احادیث اہل بدعت کی نفسانی اغراض سے محفوظ رہیں۔

## اقوال وافعال نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل طور پر محفوظ ہیں:

احادیث کی اسناد، متون اور اسماء الرجال کی کتابوں کو بغور دیکھنے سے دل کو پورا یقین ہوجاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال بغیر کسی ردوبدل کے محفوظ ہوگئے ہیں۔ یہ وضاحت تو اخبار آحاد (خبر واحد کی جمع) سے متعلق ہے۔

اگر احادیث کی کتابوں کو جمع کر کے ان احادیث کی اسناد ومتون کو دیکھا جائے تو اکثر متون میں اتحاد واشتراک اور اسناد میں تعدد اور کثرت نظر آئے گی۔ جس سے وہ احادیث معنوی اعتبار سے "متواتر" ہوجاتی ہیں۔ متواتر احادیث میں عام روایات کی طرح شبہات کی گنجائش نہیں رہتی۔

## دوسری غلطی: درایت (عقل) کے ذریعے احادیث پر اعتراضات کرنا

سابقہ بحث سے احادیث کی حجیت ثابت ہونے کے بعد معلوم ہوگیا کہ احادیث پر درایت (عقل) سے تنقید کرنا غلط ہے۔ کیونکہ حدیث صحیح کا ادنی درجہ یہ ہے کہ وہ ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے ظنی ہو، جبکہ درایت عقلی ظنی دلیل کو کہتے ہیں اور (اصول نمبر 7 میں) پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کہ دلیل نقلی ظنی دلیل عقلی ظنی پر مقدم ہوتی ہے۔

## روایت بالمعنی کی تحقیق

اب رہی بات روایت بالمعنی یعنی اپنے الفاظ میں احادیث کو بیان کرنے کی، تو اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا:

1) لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ بغیر ضرورت کے کوئی صحابی روایت بالمعنی نہیں کرتا تھا اور نہ اس کی عادت تھی۔ ان کے مضبوط حافظے کی وجہ سے انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

2) کتب حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر احادیث کو مختلف صحابہ کرام نے روایت کیا ہے۔

لہٰذا اگر کسی نے روایت بالمعنی کی تو دوسرے نے روایت باللفظ کردی، پھر دونوں روایتوں کا معنی ایک جیسا ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ جن صحابہ کرام نے روایت کو معناً نقل کیا، انہوں نے بھی اصل مضمون کے سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں کی۔

3) اگر کہیں الفاظ بالکل بھی محفوظ نہ رہے ہوں، اگرچہ ایسا شاذ ونادر ہی ہے، تو پھر بھی

ظاہر ہے کہ آدمی کا قریبی اور مزاج شناس دوست جس طرح اس کی بات کو موقع محل کی مناسبت سے سمجھ سکتا ہے، دوسرا ہر گز نہیں سمجھ سکتا۔

اس لیے قرآن وحدیث کے بارے میں حضرات صحابہ کرام کی سمجھ جتنی قابل بھروسہ ہے، دوسروں کی اتنی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ لوگوں کا صحابہ کرام کے فہم کے برعکس، قرآن سے یا محض اپنی عقل سے کچھ سمجھ کر احادیث کو رد کرنا اس قابل نہیں ہے کہ اسے وقعت دی جائے۔

4) سابقہ تمام امور کا لحاظ کرتے ہوئے، پھر بھی اگر کوئی شبہ باقی رہے، تو وہ بعض احادیث کی قطعیت کے بارے میں ہوسکتا ہے۔

سو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان احادیث سے جو احکام ثابت ہوں گے، وہ ظنی ہوں گے۔ لیکن ظنی احکام بھی تو دین کا حصہ اور واجب العمل ہیں۔ اس لیے ظنیت سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

# چھٹا انتباہ: اجماع سے متعلق غلط فہمیاں

**اجماع کی تعریف:** اجماع کا لغوی معنی ہے: "کسی چیز کا پختہ ارادہ کرنا۔ اتفاق کرنا"۔

اصطلاحاً: "امت محمدیہ کے مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، کسی زمانے میں اتفاق کرنا"۔

## اجماع سے متعلق پہلی غلطی: اجماع کو حجت نہ سمجھنا اور محض رائے کا درجہ دینا:

بعض لوگ اجماع کو "لازمی حجت" سمجھنے کے بجائے، محض "ایک رائے" سمجھتے ہیں، اس لیے اجماع کو حجت شرعی نہیں مانتے۔

**جواب:**

اجماع کو "محض رائے" سمجھنا، نقل وعقل دونوں کے خلاف ہے۔ کئی آیات واحادیث سے حجیت اجماع ثابت ہے۔

### حجیت اجماع کے نقلی وعقلی دلائل:

1) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ

الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء:115)

اور جو شخص اپنے سامنے ہدایت واضح ہونے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے، اس کو ہم اس راہ کے حوالے کر دیں گے، جو اس نے خود اپنائی ہے، اور اسے دوزخ میں جھونکیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اس آیت کریمہ میں "سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ" سے مراد اجماع ہے۔ جس کے ترک کرنے اور چھوڑنے پر اللہ تعالی نے جہنم کی وعید بیان فرمائی ہے۔

2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: " إِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِي - أَوْ قَالَ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ - عَلَى ضَلَالَةٍ ۔ وَيَدُ اللهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شُذَّ إِلَى النَّارِ" (جامع ترمذی:2167) بے شک اللہ تعالی میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ اللہ تعالی کا ہاتھ (مدد و نصرت) جماعت کے ساتھ ہے۔ جو شخص جماعت سے الگ ہوا، وہ جہنم میں گرا۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اگر امت کے علماء کسی مسئلے پر متفق ہو جائیں تو وہی ہدایت ہے، اور اس کی مخالفت گمراہی ہوگی۔

3) نیز جس طرح قانون کی کوئی کتاب حجت ہو تو اس کی تمام دفعات واجب العمل ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب قرآن وحدیث حجت ہیں، تو ان کے بھی تمام قوانین واجب العمل ہوں گے۔ ان قوانین میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ اجماع قطعی حجت ہے۔ لہٰذا اس قانون پر بھی عمل کرنا واجب ہوگا۔ اس کی مخالفت درحقیقت قرآن وحدیث کی مخالفت ہوگی۔

4) عقل بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ اجماع حجت ہے۔ کیونکہ قانون فطری عقلی کے تحت، انفرادی رائے کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اجماع تو اکثریت کی رائے سے بڑھ کر، جمہور علمائے امت کی متفقہ رائے کا نام ہے، تو اس کی حیثیت انفرادی رائے کے برابر یا اس سے کم کیسے ہو سکتی ہے؟

## دوسری غلطی: اسلاف کے اجماع کے خلاف بعد والوں کے اتفاق یا اجماع کے مقابلے میں صریح نص کا مغالطہ:

### شبہ:

یقیناً انفرادی رائے کی اجماع کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن اگر ہم بھی اجماع کے مقابلے میں ایک دوسری رائے پر اتفاق کرلیں، تو ہماری متفقہ رائے اجماع کے مدمقابل بن سکتی ہے اور اس میں معارضہ یعنی ٹکراؤ کی صلاحیت ہوسکتی ہے؟۔

### جواب:

اسلاف کے اجماع کے خلاف، بعد والوں کے "اتفاق" کی متعدد نوعیتیں ہیں:

### 1) اسلاف کا اجماع "قیاس" کی بنا پر ہو، بعد والے اس کے خلاف اتفاق کریں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ چونکہ اجماع عام اشخاص کی رائے سے نہیں بنتا، بلکہ ماہر مجتہدین کا اتفاق ہوتا ہے۔ اصول بھی یہی ہے کہ ہر فن میں اس کے ماہرین کا اتفاق معتبر ہوتا ہے۔

چنانچہ اگر ہم اپنی دینی حالت کا اسلاف کی حالت سے انصاف کے ساتھ موازنہ کریں، تو علم وعمل میں تنزلی کی وجہ سے، ہماری ان کے ساتھ وہی نسبت ہے، جو اناڑیوں کی ماہرین کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے خلاف ہمارا اتفاق ایسے ہی غیر معتبر ہوگا جیسے اناڑیوں کا اتفاق ماہرین کے خلاف۔ ہاں! البتہ اگر کسی مسئلے میں سلف صالحین سے کچھ منقول نہ ہو، تو وہاں دینی ضرورت کے تحت، موجودہ وقت کے علماء کا اتفاق معتبر ہوگا۔

اس میں ایک فطری راز یہ ہے کہ دستور الٰہی ہے کہ جو کام خلوص سے کیا جاتا ہے اس میں، تائید الٰہی شامل ہوتی ہے، جبکہ خواہش پرستی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ سلف صالحین کے اجماع کی موجودگی میں، بلاضرورت اپنی رائے پر عمل کرنا خواہش پرستی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی۔

### 2) اسلاف کا اجماع "نص" پر ہو تو بعد والوں کے اجماع کی حیثیت؟

اگر اسلاف کا کسی نص یعنی قرآن وحدیث کے صریح مدلول پر اجماع ہوگیا ہو، تو اس

کی مخالفت صرف اجماع کی نہیں، بلکہ صریح آیت یا حدیث کی مخالفت ہوگی۔

## 3) اسلاف کا اجماع "نص" پر ہو، اس کے مقابلے میں "نص" ہو تو مخالفت اجماع کی حیثیت؟

تب بھی جس نص پر اجماع ہو، اس کی مخالفت جائز نہیں، بلکہ اسی پر عمل کرنا لازم ہے۔ اس لیے کہ دونوں آیات یا احادیث قوت میں برابر ہیں اور ایک کو اجماع کی وجہ سے مزید قوت حاصل ہوگئی۔ اور قوی دلیل کے ہوتے ہوئے ضعیف پر عمل کرنا نقل اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

## 4) اسلاف کے اجماع کا دارومدار کسی ظاہری نص پر نہ ہو، ایسے اجماع کے مقابلے میں "نص" ہو تو اس کی حیثیت؟

اگر اجماع کا ماخذ کوئی صریح آیت یا حدیث نہ ہو، جبکہ اجماع کے خلاف کوئی دوسری نص موجود ہو، تب بھی اجماع کو یہ سمجھ کر فوقیت دی جائے گی، کہ اجماع کے وقت اسلاف کے سامنے کوئی نص ہوگی جو منقول نہیں ہوسکی۔ اس لیے کہ نص کی مخالفت گمراہی ہے اور اجماع کا گمراہی ہونا محال ہے۔ لہٰذا اجماع کا نص کے خلاف ہونا بھی محال ہے۔

پس لامحالہ یہ اجماع یقینی طور پر نص کے مطابق ہوگا۔ اور جس نص کے مطابق ہوگا، وہ اجماع کی وجہ سے دوسری نص پر مقدم ہوگی۔ حقیقت میں نص کو ہی نص پر فوقیت ہے اور اجماع اس نص کے وجود کی علامت اور نشانی ہے جسے "دلیل انی" کہتے ہیں۔ اس بات کو مثال کے ذریعے سمجھیے!

### پہلی مثال: بغیر سفر و عذر کے، دو فرض نمازیں ایک وقت میں ایک ساتھ ادا کرنا:

حدیث شریف میں ہے: "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خوف اور بارش کے مدینے میں ظہر اور عصر کو ایک ساتھ، جبکہ مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ جمع کیا۔ (ترمذی: 187)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا عذر بھی حقیقتاً دو فرض نمازوں کو جمع کرنا اور انہیں اکٹھے ادا کرنا جائز ہے، لیکن علماء کا اجماع ہے کہ دو نمازوں کو حقیقتاً ایک وقت میں ایک ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

## دوسری مثال: سحری کا وقت

حدیث شریف میں ہے: ”حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کھاؤ اور پیو، تمہیں کھانے پینے سے چمکتی اور چڑھتی ہوئی صبح نہ روکے، یہاں تک کہ تمہارے لیے سرخ لکیر ظاہر ہو۔ (ترمذی:705)

ظاہری طور پر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح صادق کے بعد بھی سحری کھائی جا سکتی ہے، مگر امت کے علماء کا اجماع اس کے خلاف ہے، کہ صبح صادق ظاہر ہونے کے بعد سحری کرنا جائز نہیں ہے۔

اجماع کا ان دونوں روایات کے خلاف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی ”واضح نص“ اہل اجماع کو اس کے خلاف ضرور ملی ہوگی، کیونکہ باطل پر اجماع ہونا، بروئے حدیث ”إِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِي عَلَى ضَلَالَةٍ“ محال ہے، اس لیے اجماع پر عمل کرنا اور ان روایات کے ظاہر کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ لہذا دو فرض نمازیں حقیقتاً اکٹھے ایک ہی وقت میں پڑھنا یا صبح صادق کے بعد بھی سحری کھانا درست نہیں۔

# ساتواں انتباہ: قیاس شرعی سے متعلق غلط فہمیاں

**قیاس کی تعریف**: قیاس کا لغوی معنی ہے: ”اندازہ کرنا“۔ اصطلاحاً: جس شئے کا حکم قرآن، حدیث اور اجماع میں صراحتاً بیان نہ کیا گیا ہو، خاص طریقے سے اس شئے کا پوشیدہ حکم قرآن و حدیث سے معلوم کرنا۔

شریعت نے ہر چیز کا حکم بیان کیا ہے، بعض چیزوں کے احکامات واضح اور ظاہر ہیں، جبکہ کچھ چیزوں کے احکام پوشیدہ ہیں، ان پوشیدہ احکام کو معلوم کرنے کے لیے قیاس کی ضرورت پڑتی ہے۔

### قیاس کا صحیح طریقہ:

مجتہد، نصوصِ شرعیہ (قرآن و حدیث) میں غور و فکر کر کے یہ دیکھتا ہے کہ جس مسئلہ کا حکم شرعی پوشیدہ ہے، وہ کسی ایسے مسئلے سے مشابہ ہے یا نہیں جس کا حکم نص میں موجود ہے۔ پھر یہ

دیکھا جاتا ہے کہ اس منصوص مسئلہ میں وہ کون سی صفت یا علت ہے، جس کی بنیاد پر شریعت نے وہ حکم دیا؟ اگر وہی صفت یا علت اس مطلوبہ نئے مسئلہ میں بھی پائی جائے، تو اس پر بھی وہی حکم لاگو کر دیا جاتا ہے۔

گویا قیاس بذاتِ خود کوئی حکم ثابت نہیں کرتا، بلکہ نص میں پوشیدہ حکم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے قیاس کے واسطے سے نص سے ظاہر ہونے والے حکم کو اٹکل اور گمان نہیں کہا جا سکتا۔

## قیاس کے اجزاء:

قیاس کے چار اجزاء ہیں:

مقیس علیہ: قرآن وحدیث میں مذکورہ منصوص مسئلہ جس پر قیاس کیا جا رہا ہے۔

مقیس: نیا مسئلہ جس کا حکم پوشیدہ ہو۔

علت: دونوں مسئلوں میں پائی جانے والی مشترک صفت، جس پر نئے مسئلے کی بنیاد ہو۔

تعدیہ: علت کے ذریعے نئے مسئلے میں حکم ثابت کرنا۔

یہ ہے قیاس شرعی کی اصل حقیقت جو شریعت کا اہم اصول ہے۔ جس کے ذریعے شریعت کے غیر منصوص مسائل (جن مسائل کے بارے میں قرآن وسنت میں صراحت سے حکم نہ آیا ہو) کا حکم معلوم کیا جاتا ہے۔ لیکن زمانۂ جدید میں اس کے استعمال میں کئی بنیادی غلطیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان غلطیوں کو ہم چار بنیادی اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

## پہلی غلطی: قیاس کی حقیقت میں تحریف

متجددین کے ہاں جس چیز کو قیاس کا نام دیا جاتا ہے، اُس کی حقیقت صرف "رائے" ہے۔ جو قرآن وحدیث سے ماخوذ نہیں ہے۔ چنانچہ اس بات کو وہ خود بھی مانتے ہیں اور یہ کہہ کر اپنی بات کو پیش کرتے ہیں کہ "ہمارا خیال ہے"، "ہمیں ایسے لگتا ہے"۔

واضح رہے کہ یہ فقہی اصطلاحی قیاس نہیں بلکہ "مستقل شارع" بننے کا دعویٰ ہے، جو عقل کے لحاظ سے بھی قابل مذمت ہے۔ اور اس کی مذمت قرآن وسنت اور اقوالِ سلف میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا عقل اور نقل دونوں لحاظ سے "محض رائے" کو قیاس کا نام دینا قابل مذمت ہے۔

## دوسری غلطی: قیاس کے موقع اور محل کی تعیین میں

دوسری غلطی قیاس کے موقع اور محل میں کی جاتی ہے۔ قیاس کا اصل محل" وہ مسائل

ہیں، جن کے بارے میں شریعت کا واضح حکم موجود نہ ہو"۔ان مسائل کا قیاس کی مدد سے شرعی حکم معلوم کیا جاتا ہے۔لیکن اس میں غلطی یہ کی جاتی ہے کہ جن مسائل کا حکم صراحتاً قرآن وحدیث میں مذکور ہے، ان کی علت نکال کر، حکم کو اس علت کے ساتھ مقید کر دیتے ہیں، کہ اگر یہ علت پائی جائے گی تو یہ حکم لاگو ہوگا ورنہ نہیں۔حالانکہ ایسا کرنا نہ صرف اصولِ فقہ کے خلاف ہے، بلکہ یہ صراحتاً نص کی خلاف ورزی ہے۔

## تیسری غلطی: قیاس کا مقصد اور دائرہ کار بھلا دینا

دوسری غلطی کے ضمن میں، تیسری غلطی غرض قیاس اور اس کے مقصد میں کی جاتی ہے۔قیاس کا مقصد اصلی "نص کے اندر موجود علت کے ذریعے، غیر منصوص مسائل میں شریعت کا حکم تلاش کرنا ہے" مگر اب قیاس کے نام پر منصوص مسائل میں بلا ضرورت خود ساختہ علت نکال کر ان میں ردوبدل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔گویا اصل حکم کو علت کے تابع کر کے، خود ساختہ علتوں کے ذریعے احکامِ شرعیہ کو منسوخ یا معطل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ طرزِ فکر انتہائی خطرناک اور ناجائز ہے۔

## چوتھی غلطی: قیاس کے اہل میں

چوتھی غلطی قیاس کی اہلیت میں کی جاتی ہے کہ "ہر شخص کو اجتہاد اور قیاس کا اہل سمجھتے ہیں" جیسا کہ بعض بے باک لوگوں نے اپنے لیکچروں میں کہا ہے کہ، آیت کریمہ "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" نے اجتہاد کو ہر شخص کے لیے عام کر دیا۔

حالانکہ آیت کریمہ کا تعلق "اجتہاد" سے ہے ہی نہیں، بلکہ آیت کریمہ میں تو شرک سے براءت کا اظہار ہے کہ: "میں نبی موحد ہو کر شرک نہیں کر سکتا، نہ اب نہ آئندہ اور تم مشرک ہو کر موحد قرار نہیں دیے جا سکتے، نہ اب نہ آئندہ۔تمہیں تمہارا بدلہ اور مجھے میرا بدلہ ملے گا"۔

اس لیے آیت کریمہ سے اجتہاد کا عام ہونا سمجھنا اور اس آیت کو دلیل میں پیش کرنا بالکل غلط ہے۔

علاوہ ازیں ماہرین اصول فقہ نے مضبوط دلائل کے ساتھ اجتہاد کی شرائط کو بیان کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہو سکتا۔

اور ظاہر سی بات ہے کہ ہر شخص اجتہاد کا اہل ہو بھی نہیں ہو سکتا۔کیوں کہ قیاس واجتہاد

کی مثال ایسے ہے جیسے وکلاء کا کسی مقدمے کو کسی قانونی دفعہ کے تحت داخل کرنا۔ سو ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص اس کا اہل ہو، تو وکالت پاس کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ پس جس طرح یہاں شرائط ہیں کہ قانون پڑھا ہو، یاد بھی ہو، اُس کا مقصد بھی سمجھا ہو، اور مقدمہ کے باریک پہلوؤں کو بھی جانتا اور سمجھتا ہو، تب اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ یہ بتائے کہ فلاں مقدمہ، فلاں قانونی دفعہ کے تحت داخل ہے۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھیے۔

## موجودہ زمانے میں ملکہ اجتہاد کا دعویٰ؟

کیا آج کے دور میں کوئی ایسا شخص پایا جاتا ہے، جو اجتہاد کی اہلیت اور اس کا ملکہ رکھتا ہو؟

## جواب:

اس پر مقلدین وغیر مقلدین کے درمیان بڑی بحث ہے، جو اس مقام کی مناسبت سے طویل ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ:

اگر بالفرض ایسا شخص اب بھی پایا جاتا ہو، تب بھی بہتری اور سلامتی اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر اصرار و اعتماد نہ کرے۔ کیوں کہ ہمارے اندر نفس پرستی اور سہولت پسندی غالب ہے۔ اگر اجتہاد سے کام لیا جائے گا، تو اس بات کا یقینی امکان ہے، کہ طبیعت کا میلان ہمیشہ خواہشات اور سہولت کی طرف ہوگا۔ اور پھر اس کو دیکھ کر دوسرے نااہل شخص ان کی آڑ میں خودساختہ اجتہاد کا دعویٰ کریں گے، جس سے دین و دیانت کا نظام برباد ہوگا۔

## حسی مثال:

اس کی حسی مثال یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے ججوں کے فیصلوں کے مقابلے میں کسی کو حتی کہ ماتحت عدالتوں کے ججوں کو بھی اپنی سمجھ کے مطابق قانونی دفعات کی تشریح کرنے کی اجازت محض اس بنا پر نہیں دی جاتی، کہ سپریم کورٹ کے ججوں کو سب سے زیادہ قانون کے معنی سمجھنے والا قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر ان کی مخالفت کی اجازت دے دی جائے تو غیر متعلقہ لوگ قانون کی من پسند تشریح کر کے ملک میں انتشار اور بدنظمی پھیلانے کا سبب بنیں گے۔ بس یہی نسبت ہمیں اپنے اور مجتہدین کے درمیان سمجھنی چاہیے۔

## چاروں اصولوں کے متعلق کی جانے والی غلطیوں کا خلاصہ:

شریعت کے چاروں اصولوں کے متعلق غلطیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو حجت

بھی مانا اور ثابت بھی، مگر اس کی دلالت اور مفہوم میں غلطی کی......حدیث کو حجت تو تسلیم کیا، مگر اس کے ثبوت میں غلطی کرتے ہوئے، اس میں شبہات نکال لیے، اس لیے دلالت اور مفہوم سے بحث ہی نہیں کی......اجماع کو حجت ہی نہیں مانا......اور قیاس کی جگہ ایک اور گھڑی ہوئی چیز یعنی "رائے" کو احکام ثابت کرنے کے لیے اصل اور معیار قرار دیا۔

## آٹھواں انتباہ: فرشتوں، جنات اور ابلیس کا وجود

فرشتوں، جنات اور شیطان ابلیس کا وجود قرآن وحدیث کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، ان کے وجود کو تسلیم کرنا فرض، جب کہ ان کا انکار کرنا کفر ہے۔آج جدید تعلیم اور مادہ پرستی نے بعض ذہنوں میں یہ غلط فہمی بھر دی ہے کہ ہر چیز محسوس اور دکھائی دینی چاہیے، ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔اسی غلط نظریے کی وجہ سے ملائکہ اور جنات کے وجود کے بارے میں خطرناک غلطیاں کی جا رہی ہے۔

### پہلی غلطی: وجود ملائکہ اور وجود جنات کا انکار

متجددین کہتے ہیں کہ جنات اور فرشتوں وغیرہ کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے، کیونکہ:

1) اگر یہ موجود ہوتے تو محسوس بھی ہوتے، نظر بھی آتے، لیکن ہمیں نا محسوس ہوتے ہیں اور نہ ہی نظر آتے ہیں۔معلوم ہوا کہ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔

2) کسی چیز کا اس طرح موجود ہونا کہ سامنے سے گزر جائے، نہ محسوس ہوا اور نہ نظر آئے، سمجھ میں نہیں آتا۔

### تحقیقی جواب:

1) کسی چیز کے موجود ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نظر بھی آئے۔

کیونکہ صرف مشاہدہ علم کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ مخبر صادق کی خبر بھی "مستقل دلیل" ہے۔

اور یہاں پر فرشتوں اور جنات کے وجود کی خبر، رب کی لاریب کتاب اور مخبر صادق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔لہٰذا ان کا وجود تسلیم کرنا ضروری ہے۔

2) کسی چیز کے سمجھ میں نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عقلاً محال ہو۔

پس جب ان کے وجود کے محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، تو ان کا وجود عقلاً

ممکن ہوا، اور جو امر عقلاً ممکن ہو، مخبر صادق اس کے وقوع اور وجود کی خبر دے تو اس کا یقین کرنا ضروری ہوتا ہے، چونکہ قرآن وحدیث میں جابجا ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے وجود کا یقین کرنا بھی واجب ہے۔

## الزامی جواب:

تمہارے بقول "مادہ" موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے ایک بالکل لطیف شکل میں تھا، جسے "مادہ سدیمیہ اور اثیریہ" کہتے ہیں۔ اس لطیف شکل کو نہ تم نے کبھی دیکھا اور نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن تم اس فرضی اور مبہم صورت کے وجود کو محسوس کیے اور دیکھے بغیر مانتے ہو، جبکہ فرشتوں اور جنات کے وجود کے لیے مشاہدے کو ضروری قرار دیتے ہو، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ "مادے" کے اس ابتدائی مبہم اور خیالی وجود کی کوئی دلیل بھی نہیں اور فرشتوں اور جنات کے وجود پر دلائل بھی موجود ہیں۔

## دوسری غلطی: فرشتوں اور جنات سے متعلق آیات قرآنیہ کے معانی میں تحریف:

چونکہ قرآن کریم میں جابجا فرشتوں اور جنات کا تذکرہ موجود ہے، اور قرآن کریم کے ثبوت کے بعد کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں رہتی اور اس کے انکار کی جراءت بھی نہیں۔ اس لیے جن آیات میں فرشتوں اور جنات کا تذکرہ موجود ہے، ان میں اس قدر دور دراز بے جا تاویلات کی جاتی ہیں، جو بالکل حد تحریف میں داخل ہیں۔

## جواب:

1) جن قرآنی آیات میں فرشتوں اور جنات کے وجود کا تذکرہ ہے، ان میں تاویلات بعیدہ کرنا باطل ہے۔ کیونکہ قرآنی آیات میں ظاہری معنی مراد لینا اصل ہے، بغیر ضرورت کے ان میں تاویلیں کرنا جائز نہیں ہے، اور یہاں پر کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

2) فرشتوں اور جنات کے انکار پر کوئی "عقلی ظنی دلیل" موجود ہوتی تو بھی عقلی دلیل کی وجہ سے "نقلی دلیل" میں تاویل جائز نہ ہوتی (دیکھیے: ساتواں اصول)۔

یہاں فرشتوں اور جنات کے انکار پر کسی قسم کی کوئی "عقلی ظنی دلیل" بھی نہیں، محض وہمی بنیاد پر ان کا انکار کیا جاتا ہے۔ تو "نقلی دلائل" میں بے جا تاویلات کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟

**فائدہ:**

بعض لوگوں نے فرشتوں اور جنات وغیرہ کے بارے میں کچھ اور شبہات بھی ظاہر کیے ہیں جو سر سید احمد خان کی تفسیر میں مذکور ہیں۔ البرہان (سر سید کی تردید میں لکھے گئے رسالے) میں ان کا جواب دیکھا جا سکتا ہے۔

## نواں انتباہ: امور آخرت سے متعلق غلط فہمیاں

### غلطی: واقعات قبر، موجوداتِ آخرت، جنت و دوزخ، صراط، میزان وغیرہ کا انکار

متجددین کہتے ہیں کہ واقعات قبر، موجوداتِ آخرت، جنت و دوزخ، پل صراط، میزان وغیرہ کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ چیزیں موجود ہوتیں تو محسوس ہوتیں، دکھائی دیتیں۔ لیکن یہ نہ محسوس ہوتی ہیں نہ نظر آتی ہیں، اس لیے معلوم ہوا کہ ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔

**جواب:**

چوتھے اصول میں بیان کیا جا چکا کہ کسی چیز کے موجود ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نظر بھی آئے۔ کیونکہ صرف مشاہدہ علم کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ مخبر صادق کی خبر بھی "مستقل دلیل" ہے۔ اور یہاں پر ان چیزوں کے وجود کی خبر، رب کی لاریب کتاب اور مخبر صادق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ لہٰذا ان کا وجود تسلیم کرنا ضروری ہے۔

**قدیم وجدید شبہات:**

بعض لوگوں نے کچھ اور شبہات بھی کیے ہیں، جن میں سے کچھ قدیم ہیں اور کچھ جدید۔ ان سب کا حاصل درج ذیل شبہات ہیں:

1) جب قبر کے اندر جسم میں روح ہی نہیں رہتی تو پھر اسے تکلیف اور راحت کا احساس کیسے ہوتا ہے؟ مردہ بغیر کان کے کیسے سنتا اور بغیر زبان کے کیسے جواب دیتا ہے؟

2) جنت اور جہنم کہاں ہیں؟ جس قدر ان کی وسعت بیان کی جاتی ہے، اس کے مطابق تو وہ کسی مکان میں سما ہی نہیں سکتے۔

3) پل صراط کی باریکی کی جیسی کیفیت بیان کی جاتی ہے، اس پر چلنا کس طرح ممکن ہے؟
4) جب اعمال کا جسم ہی نہیں ہے تو ان کو میزان میں کیسے تولا جائے گا؟
5) اعضائے جسمانی یعنی ہاتھ پاؤں کا بولنا بھلا کس طرح ممکن ہے؟

## مذکورہ شبہات کا مشترکہ اصولی جواب:

ان سب شبہات کا مشترکہ جواب یہ ہے کہ ان سب شبہات کی وجہ اور بنیاد "ان چیزوں کا مستبعد ہونا" ہے۔ حالانکہ کسی شئے کے مستبعد (حیران کن اور عجیب) ہونے سے محال ہونا لازم نہیں آتا۔ تو جب یہ سب چیزیں عقلاً محال نہیں، بلکہ ممکن ہیں اور قرآن وحدیث نے ان کے وقوع کی خبر دی ہے، تو اصول کے مطابق ان کا ماننا ضروری ہے (ملاحظہ کیجیے دوسرا اصول)۔

## خاص خاص جوابات:

### 1) قبر کی تکلیف وراحت سے متعلق شبہے کا جواب:

قبر کی تکلیف وراحت کے متعلق دو احتمالات ہیں:

**اول:** ممکن ہے کہ بدن میں اتنی روح موجود رہتی ہو، جس سے وہ تکلیف اور راحت کو محسوس کرتا ہو۔ برزخ کے احوال کا تو اس پر اثر ہو، دنیا کی اثر انداز ہونے والی چیزوں سے متاثر نہ ہو، اور نہ عالَم کے الگ ہونے کی وجہ سے ہمیں حرکت کرتا دکھائی دے۔

**دوم:** یہ بھی ممکن ہے کہ اس بدنِ عنصری پر براہ راست رنج وتکلیف اور لذت وراحت کا اثر نہ ہوتا ہو، بلکہ روح جہاں پر موجود ہو، وہیں اس پر سب کچھ گزرتا ہو۔

**سوال:** رہا یہ سوال کہ روح کہاں ہے؟

**جواب:** ممکن ہے کہ وسیع فضا کے کسی حصے میں ہو اور وہی "عالَمِ ارواح" کہلاتا ہو۔

**سوال:** بدن جل جائے یا پرندے اور جانور کھا جائیں، تو عذاب وثواب کس طرح ہوتا ہے؟

**جواب:** عالَمِ ارواح میں روح پر عذاب وثواب کے اس امکان سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ اگر کوئی جسم جل جائے یا کوئی پرندہ یا جانور کھا لے تو اس صورت میں عذاب وغیرہ کیسے ہوگا؟ کیونکہ جب روح پر عذاب وثواب ہو تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

**سوال:** قبر میں بغیر کان کے سننا اور بغیر زبان کے بولنا کس طرح ہو سکتا ہے؟

**جواب:** پہلی بات یہ ہے سننے اور بولنے کے لیے کان اور زبان کا ہونا عقلی شرط نہیں ہے، بلکہ یہ عادتاً سننے اور بولنے کے آلات ہیں۔ عقل اور عادت دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ عقلی طور پر اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ:

1) ممکن ہے کہ عالمِ برزخ کی عادت، عالمِ دنیا سے مختلف ہو اور وہاں سننے اور بولنے کے لیے ان اعضا کا ہونا ضروری نہ ہو۔

2) یہ بھی ممکن ہے کہ عالمِ برزخ میں روح کو "جسمِ مثالی" مل جاتا ہو، جس میں یہ تمام آلات موجود ہوں۔ جیسا کہ بعض اہل کشف اس کے قائل بھی ہیں۔

## 2) جنت ودوزخ سے متعلق شبہے کا جواب:

جنت ودوزخ ممکن ہے کہ وسیع فضا کے کسی حصے میں ہوں۔ فضا کو تو موجودہ فلاسفہ اور سائنسدان بھی غیر محدود مانتے ہیں تو جنت اور جہنم کا اس وسیع فضا میں موجود ہونا کون سی ناممکن چیز ہے؟

## 3) پل صراط سے متعلق شبہے کا جواب:

پل صراط پر اس کی کیفیتِ عجیبہ کے ساتھ چلنا، اگرچہ "عجیب" معلوم ہوتا ہے، مگر "محال" نہیں ہے۔ محض "عجیب" ہونے کی وجہ سے کسی شے کا انکار کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ محال اور مستبعد (عجیب) میں بڑا فرق ہے (ملاحظہ کیجیے تیسرا اصول)۔

## 4) وزنِ اعمال سے متعلق شبہے کا جواب:

میزان میں اعمال کا وزن کیا جانا اس طرح ممکن ہے کہ:

1) اعمال جن صحیفوں میں لکھے جاتے ہیں، وہ صحیفے تولے جائیں گے، وہ صحیفے اجسام ہیں۔ جیسا کہ بعض احادیث میں وزنِ اعمال کے سلسلہ میں "بِطَاقَة" اور "سِجِلَّات" کے الفاظ آئے ہیں، جن کا معنیٰ "کاغذ کا ٹکڑا" اور "رجسٹر" کے ہیں۔

2) خود اعمال کو تولا جائے گا۔

کیونکہ وزن کے لیے جسم کا ہونا عقلی شرط نہیں ہے، بلکہ عادی ہے۔ ممکن ہے کہ عالمِ برزخ کی عادت، عالمِ دنیا سے مختلف ہو اور وہاں غیر اجسام کا بھی وزن ہو۔، اور بعض حصے مقدار میں برابر ہونے کے باوجود اخلاص وغیرہ کی کمی بیشی وجہ سے ہلکے اور وزنی ہونے میں مختلف

ہوں۔ جیسے دو جسم جن کی مقدار و حقیقت ایک ہو، لیکن حرارت و ٹھنڈک میں فرق ہو تو اس فرق سے ان کے وزن میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔

جدید دور میں جب تھرمامیٹر سے حرارت اور اسی طرح دیگر خاص آلات سے ہوا اور بجلی کا وزن کرنا ممکن ہو چکا تو اعمال کے وزن میں کیوں کر شبہ کیا جا سکتا ہے؟

### 5) ہاتھ پاؤں کے بولنے سے متعلق شبہے کا جواب:

اعضائے جسمانی یعنی ہاتھ پاؤں کا بولنا خلاف عادت ہونے کی وجہ سے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ عقلاً "محال" نہیں، بلکہ "ممکن" ہے۔ اور جب سے موبائل اور ریکارڈر دیکھا ہے اب تو اعضاء کے بولنے کو عجیب اور حیران کن کہنا بھی بے جا معلوم ہونے لگا ہے۔

## دسواں انتباہ: کائنات طبعیہ (سائنسی تطبیقات پر کلام)

اگرچہ سائنسی چیزوں سے بحث کرنا شریعت مطہرہ کا مقصد نہیں ہے۔ مگر مقصود کے لیے تابع ہونے کی حیثیت سے شریعت میں اس سے مختصر بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کی پوری حقیقت کی تفتیش اس لیے بھی ضروری نہیں کہ یہ غرضِ شریعت خالق ومخلوق کے حقوق کی ادائیگی سے تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن جتنی اور جس طرح قرآن وحدیث میں ان کی حقیقت ذکر کی گئی ہے، اس کے خلاف عقیدہ رکھنا یا اسے جھٹلانا جائز نہیں ہے۔

اس انتباہ میں چند سائنسی اور کائناتی امور نمونہ کے طور پر بیان کیے جاتے ہیں، تاکہ حقیقت واضح رہے اور ایمان مضبوط ہو۔

## چند سائنسی مسائل

### 1) سب سے پہلے انسان کی تخلیق:

#### اہل اسلام کا نظریہ تخلیق:

اہلِ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالی نے، مٹی سے ایک انسان "حضرت آدم" کو پیدا فرمایا، پھر تمام انسان، بحکم خدا انہی کی نسل سے، توالد وتناسل کے طریقہ پر پیدا ہوتے چلے گئے۔

## چارلس ڈارون اور اس کے متبعین کا نظریہ ارتقاء:

انسان پہلے بندر کی صورت میں تھا، پھر بغیر کسی خالق کی تخلیق کے، جس وقت ترقی کرتے کرتے، بندروں کی طبیعتِ حیوانیہ میں انسان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی، تو ایک ہی وقت میں بندروں کی ایک بہت بڑی تعداد انسان بن گئی۔

## نظریہ ڈارون کی تردید:

ڈارون کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث میں واضح طور پر پہلے انسان کا مٹی سے پیدا ہونا مذکور ہے اور اس کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہ ڈارون کے پاس ہے اور نہ ڈارون کے ماننے والوں کے پاس۔ بلکہ ڈارون نے محض اندازے سے یہ نظریہ گھڑا، جبکہ مقلدینِ ڈارون، محض ڈارون کی تقلید سے اس نظریے کے قائل ہوئے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو "اصول اور فروع" میں اہلِ اسلام کے لیے ڈارون کی تقلید ہی ناممکن ہے۔

"اصول" میں اس لیے تقلید ناممکن ہے، کہ اہل سلام وجودِ خدا کے قائل ہیں اور ڈارون "دہریہ" ہونے کی وجہ سے وجودِ خدا کا انکاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون نے "نظریہ ارتقاء" ایجاد کیا، اور نظریہ ارتقاء ایجاد کر کے ہر چیز کے وجود کی طبعی علت نکال لی، مگر جو لوگ اللہ تعالی کے وجود کو مانتے ہیں، وہ نظریہ ارتقاء کے بجائے نظریہ تخلیق کے قائل ہو سکتے ہیں، تو پھر ایسے عجیب وغریب نظریے کے قائل ہونے کی انہیں کیا ضرورت ہے؟

"فروع" میں اس لیے تقلید ناممکن ہے کہ ڈارون بطور ارتقاء، حیوان کے انسان بن جانے کا کسی ایک فرد میں قائل نہیں، بلکہ اس کے بقول جس وقت ترقی کرتے کرتے حیوانی طبیعت میں انسان بننے کی صلاحیت پیدا ہوئی، تو ایک ہی وقت میں، بڑی تعداد میں بندر انسان بن گئے، جبکہ مسلمان اس کے قائل نہیں ہو سکتے، کیونکہ قرآن وحدیث میں پہلے انسان کا اکیلے مٹی سے پیدا ہونا بیان ہوا ہے۔ لہٰذا "فروع" میں بھی ڈارون کی تقلید میں موافقت ممکن نہیں۔

اس زمانے میں بعض ناعاقبت اندیش گستاخ لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ "جو بندر سب سے پہلے انسان بنا العیاذ باللہ! آدم اسی کا نام ہے۔! اس بات میں گستاخی تو ہے ہی، مگر افسوس کہ اس گستاخی کے باوجود بھی ڈارون کی موافقت کی دولت نصیب نہ ہوئی۔ اِدھر سے بھگائے گئے، اُدھر اعتبار نہ رہا۔ "نہ خدا ملا نہ ہی وصالِ صنم" والی مثال صادق آ گئی۔

## 2) کڑک، بجلی اور بارش:

کڑک، بجلی اور بارش کے ظہور میں آنے اور برسنے کے جو اسباب قرآن وسنت میں وارد ہیں، ان کا انکار محض اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ بعض سائنسی آلات کے ذریعے ان چیزوں کے وجود میں آنے کے اسباب دوسرے طریقے سے دیکھے گئے ہیں۔

**جواب:**

قرآن وسنت میں وارد اسباب اور مشاہدہ کیے گئے اسباب میں نہ تو کوئی تعارض ہے اور نہ تعارض کی کوئی دلیل۔ بلکہ تطبیق ممکن ہے۔

وہ اس طرح کہ کڑک، بجلی اور بارش رونما ہونے کے جن اسباب کا مشاہدہ سائنس کے ذریعے ہوا ہے، ان کا انکار نہیں لیکن صرف انہی کو اسبابِ حقیقی سمجھنا اور انہی اسباب میں ان چیزوں کا ظہور منحصر سمجھنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان چیزوں کے ظہور میں کوئی اور سبب شامل ہو جائے تو یہ کوئی محال نہیں ہے۔

اس لیے ممکن ہے کہ کبھی تو ان چیزوں کے ظہور کے وہی اسباب ہوتے ہوں، جو اہلِ سائنس بیان کرتے ہیں اور کبھی دیگر اسباب سے بھی ان کا ظہور ہوتا ہو، جیسا کہ روایات میں کڑک اور بجلی کا سبب "سَوطُ الملَک" یعنی فرشتے کا "سوٹا اور ڈنڈا" بتایا گیا ہے۔ اس وجہ سے سبب کا انحصار صرف سائنسی توجیہ میں منحصر نہیں ہے۔

## 3) اسبابِ طاعون:

بعض روایات میں طاعون (وبائی اور مہلک مرض) کا سبب "گناہ اور وخزِ جن" یعنی "جنات کا کچوکا اور چبھونا" بتلایا گیا ہے، جبکہ جدید ڈاکٹر اور سائنس دان طاعون کا سبب "جراثیم" بتلاتے ہیں، جس کی وجہ سے کچھ لوگ ان روایات کا انکار کرتے ہیں، جن میں طاعون کا سبب "گناہ اور جنات کا چبھونا" بتلایا گیا ہے۔

**جواب:**

سائنسی تحقیق اور روایات میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں میں تطبیق ممکن ہے۔ وہ اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کے ایک سبب کی خبر دی ہے۔ روایات میں دیگر

اسباب کا انکار نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ طاعون کا ظاہری سبب "جراثیم" ہوں اور اصل اور حقیقی سبب "وخزِ جن یعنی جنات کا چبھونا ہوتا ہو" گویا طاعون جراثیم اور جنات کے چبھونے دونوں کے جمع ہونے سے ظہور میں آتا ہو، تو بے جا روایات کے انکار کی کیا ضرورت ہے؟

## 4) بیماری کا متعدی (مریض سے تندرست آدمی کی طرف منتقل) ہونا:

بعض روایات میں امراض کے متعدی ہونے اور ایک سے دوسرے کو لگنے کی نفی ہے "لَا عَدْوٰی" جبکہ سائنسی تجربات اور مشاہدے سے بعض امراض کا متعدی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کچھ ماڈرن لوگ روایات کا انکار کرنے لگتے ہیں۔

### جواب:

روایت میں مذکور مرض کے متعدی ہونے کی نفی اور سائنسی مشاہدے کے ذریعے متعدی ہونے کی بات میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ایک کا انکار اور دوسرے کو تسلیم کیا جائے۔ بلکہ دونوں میں تطبیق ممکن ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حدیث میں بیماری کے متعدی ہونے کی جو نفی کی گئی ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک کی بیماری دوسرے کو کبھی نہیں لگتی، کیونکہ مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ بعض بیماریوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ اصل مقصد ان لوگوں کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ "کچھ بیماریاں بالذات لازماً متعدی ہوتی ہیں، ان کا اثر کبھی روکا نہیں جاسکتا"۔ تو اسلام نے "امراض کے بالذات متعدی ہونے" جیسے عقیدے کی نفی کی ہے، نہ کہ مطلقاً بیماری کے متعدی ہونے کی۔ یعنی بیماری کا لگنا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے، بالذات بیماریوں میں متعدی ہونے کی کوئی لازمی خاصیت نہیں ہوتی ہے۔

## 5) زمینوں کا متعدد ہونا:

قرآن وسنت میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی، اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے سات پیدا کی ہیں "وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ"۔ بعض لوگ زمینوں کے سات ہونے کا انکار محض اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ ہم تو سب جگہ گھوم چکے، ہمیں تو کوئی دوسری زمین نظر نہیں آئی۔

**جواب:**

"کسی چیز کے موجود ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نظر بھی آئے" کیونکہ صرف مشاہدہ علم کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ مخبر صادق کی خبر بھی "مستقل دلیل" ہے۔اور یہاں پر متعدد زمینوں کے وجود کی خبر، رب کی لاریب کتاب اور مخبر صادق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔لہٰذا محض مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے تعددِ ارض کا انکار کرنا باطل ہے۔

**سوال:** روایت میں مذکور ہے کہ ایک زمین کے نیچے دوسری زمین ہے، دوسری کے نیچے تیسری، اسی طرح سات زمینیں ہیں (ترمذی:3298)۔لیکن اہلِ سائنس کہتے ہیں کہ ہم نے کرۂ ارض کے اردگرد پھر کر دیکھ لیا ہے، کسی جانب بھی وہ موجود نہیں ہیں۔

**جواب:** ممکن ہے کہ وہ زمینیں وسیع فضا میں ہماری زمین سے اس قدر دور ہوں کہ نظر نہ آتی ہوں۔ یا ہم سے دور ہونے کی وجہ سے بہت چھوٹی نظر آتی ہوں اور ہم ان زمینوں کو سیارے سمجھتے ہوں۔اور "نیچے ہونا" بعض حالات یا اوقات کے اعتبار سے ہو یعنی بعض حالات یا اوقات میں وہ ہماری زمین کے نیچے ہوتی ہوں، نہ کہ ہر وقت اور ہر حالت میں۔

## 6) وجودِ یاجوج ماجوج

قرآن وسنت میں یاجوج ماجوج کے وجود کا تذکرہ صراحتاً موجود ہے، جس پر یقین رکھنا واجب ہے، مگر بعض لوگ ان کے وجود کا انکار کرتے ہیں، دلیل میں اپنا "عدمِ مشاہدہ" پیش کرتے ہیں کہ ہم نے ساری زمین کو چھان ڈالا، مگر کہیں ان کا پتہ نہیں ملا۔ظاہر ہے کہ اگر یاجوج ماجوج موجود ہوتے تو ہمیں نظر بھی آتے۔نظر نہ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔

**جواب:**

1) کسی چیز کے موجود ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نظر بھی آئے۔

2) ممکن ہے کہ کوئی بڑا جزیرہ جو ابھی تک دریافت ہونے سے رہ گیا ہو، اس میں موجود ہوں اور ہمارے اور ان کے درمیان بڑے بڑے سمندر حائل ہوں۔

کسی شے کا وجود نہ ملنے سے اس کا غیر موجود ہونا لازم نہیں آتا۔کیونکہ صرف مشاہدہ علم کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ مخبر صادق کی خبر بھی "مستقل دلیل" ہے۔اور یہاں پر یاجوج ماجوج کے

وجود کی خبر، رب کی لاریب کتاب اور مخبر صادق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے۔ لہٰذا ان کا وجود تسلیم کرنا ضروری ہے۔

## 7) آسمان کے جسم کا ٹھوس و مضبوط اور متعدد ہونا

قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کے اجسام ٹھوس اور مضبوط ہیں، نیز آسمان متعدد یعنی سات ہیں۔ قرآن وسنت کے ارشاد کے مطابق ان کی تصدیق اور ان کا یقین رکھنا ضروری ہے۔ مگر بعض اہلِ سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمانوں کا کوئی وجود نہیں ہے، دلیل میں اپنا "عدمِ مشاہدہ" پیش کرتے ہیں کہ ہمیں نہ آسمان دکھائی دیتے ہیں اور نہ آسمانوں کے وجود کا ہمیں علم ہے۔

**جواب:**

کسی شے کا مشاہدہ نہ ہونا اس کے غیر موجود ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اہلِ اسلام کے نظریے کے مطابق آسمانوں کا وجود عقلاً ممکن ہے، جو امر عقلاً ممکن ہو، مخبر صادق اس کے وجود کی خبر دے تو اس کی تصدیق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ آسمانوں کے وجود کی خبر مخبرِ صادق رب کی لاریب کتاب قرآنِ کریم نے دی ہے: "اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا" اس لیے آسمانوں کے وجود کا قائل ہونا اور ان کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔

## 8) شمس وقمر وغیرہ کا متحرک ہونا:

بعض لوگ سورج کو متحرک کے بجائے ساکن مانتے ہیں۔

**جواب:**

نصوص سے ثابت ہے کہ سورج اور چاند وغیرہ متحرک ہیں، محض دیکھنے کے اعتبار سے نہیں بلکہ حقیقت میں متحرک ہیں یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ جب قرآن وسنت سے سورج کا متحرک ہونا ثابت ہے تو اس کی تصدیق لازم ہے۔ (نوٹ: اب اہل سائنس بھی سورج میں خاص حرکت کے قائل ہو چکے ہیں)۔

## 9) سورج کا مغرب سے نکلنا

احادیث سے ثابت ہے کہ قربِ قیامت میں سورج ایک دن مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ کچھ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سورج کو ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتے دیکھا، کبھی موجودہ نظام کے خلاف ہوتے نہیں دیکھا، اس لیے سورج کا موجودہ نظام کے خلاف مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہونا محال ہے۔

### جواب:

سورج کو ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا، کہ مغرب سے طلوع ہونا محال ہے، کیونکہ "ہمیشگی" کا مطلب یہ نہیں کہ یہی لازمی ہے، اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ذریعے جب چاہے اس نظام کو ایک دن یا ہمیشہ کے لیے تبدیل کرسکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

## 10) انسانی جسم کا اتنی بلندی پر پہنچنا جہاں ہوا نہ ہو اور معراجِ جسمانی

قرآن وسنت سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعۂ معراج اور آپ کا آسمان سے بھی اوپر جانا ثابت ہے۔ منکرینِ معراج کہتے ہیں کہ کرۂ زمین کی حدود سے باہر ہوا اور آکسیجن نہیں ہے، جبکہ بغیر آکسیجن کے خلا میں زندہ رہنا محال ہے۔ لہذا ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔

### جواب:

خلا میں انسان کا زندہ رہنا اس وقت محال ہے، جب وہاں کچھ دیر تک قیام ہو، اور اگر بجلی کی طرح اسے عبور کرلیا جائے تو پھر یہ محال نہیں ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ہاتھ کو کچھ دیر تک آگ میں رکھا جائے تو جل جاتا ہے، لیکن اگر آگ کے اندر تیزی کے ساتھ ہاتھ گزارا جائے تو ہاتھ جلنے سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر سفرِ معراج کے دوران خلا کو تیزی کے ساتھ عبور کرکے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر آسمانوں پر لے جایا گیا ہو تو یہ محال نہیں، بلکہ امرِ ممکن ہے، مخبرِ صادق کی خبر سے ثابت بھی ہے، تو اصول کے مطابق اس کا قائل ہونا اور اس کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔

# گیارہواں انتباہ: مسئلہ تقدیر سے متعلق غلط فہمیاں

تقدیر کا مطلب: تقدیر کا لغوی معنی ہے: "اندازہ کرنا"۔ اصطلاحاً: کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہو چکا ہے یا آئندہ مستقبل میں جو کچھ ہوگا، اللہ تعالی کے علم اور ارادے کے مطابق ہو رہا ہے...... فائدہ: عقیدہ تقدیر کو تسلیم کرنے سے انسان مجبور محض نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا ارادہ واختیار باقی رہتا ہے...... مسئلہ تقدیر کی بنیاد اور مرجع: "اللہ تعالیٰ کا علم اور ارادہ" ہے...... جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کمال کا قائل ہوگا، وہ مسئلہ تقدیر کا بھی لازماً قائل ہوگا...... آج کل مسئلہ تقدیر میں بھی چند غلطیاں کی جا رہی ہیں:

## پہلی غلطی: مسئلہ تقدیر کا انکار

بعض لوگ تو بالکل تقدیر ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور انکار کی وجہ ان کا یہ خیال ہے کہ تقدیر کو ماننے سے ظاہری اسباب اور تدبیر کا چھوڑنا لازم آتا ہے۔ امت میں کم ہمتی اور پستی کی اصل بنیاد یہی ظاہری اسباب اور تدبیر کا چھوڑنا ہے۔

### جواب:

دراصل یہ خیال ہی غلط ہے۔ کوئی شخص اپنی کم عقلی کی وجہ سے تدبیر کو اگر چھوڑ دے، تو مسئلہ تقدیر اس کا ذمہ دار نہیں۔ قرآن وسنت نے تدبیر اختیار کرنے کو غلط نہیں کہا، بلکہ اس کی ترغیب دی ہے۔

چنانچہ محنت اور کوشش کرنا، روزی کمانے کے لیے تگ ودو کرنا، سفر کے لیے زادِ راہ لینا، بیماریوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچنے کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا، دشمنوں کی سازشوں سے بچنے کے لیے اقدامات اٹھانا وغیرہ جیسی بے شمار ہدایات قرآن وحدیث میں واضح طور پر موجود ہیں۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا دعا اور دوا تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: "هِيَ مِنْ قَدَرِ اللهِ" (جامع ترمذی: 2148) یہ سب بھی تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے ہیں، یعنی دوا اور دعا بھی تقدیر کا حصہ ہیں، تقدیر سے باہر نہیں ہیں۔

## دوسری غلطی: مسئلہ تقدیر کی اصل تفسیر میں تحریف

بعض لوگوں نے تقدیر سے متعلق واضح آیات اور روایات کی موجودگی کی وجہ سے، تقدیر کا انکار تو نہیں کیا، مگر یہ سمجھ کر کہ مسئلہ تقدیر سے انسان کا مجبور و بے اختیار ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ یہ مشاہدے کے خلاف ہے، اس کی تفسیر بدل ڈالی، اور کہا کہ تقدیر "محض علمِ الٰہی" کا نام ہے، اور علم کا چونکہ معلومات میں دخل نہیں ہوتا، اس لیے اس تفسیر کے مطابق مجبور ہونے والا اشکال لازم نہیں آتا۔

اس کی مثال یہ دی کہ جیسے کوئی نجومی اپنے علم کی بنیاد پر یہ پیشین گوئی کرے کہ، فلاں شخص فلاں تاریخ کو کنویں میں گر کر مر جائے گا، پھر واقعی ایسا ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نجومی نے اس شخص کو قتل کر دیا۔

### جواب:

قرآن و حدیث میں غور کرنے والا ہر شخص جانتا ہے، اور عقل بھی مانتی ہے کہ اس دنیا میں ہونے والا کوئی بھی واقعہ جس طرح "علمِ الٰہی" کے بغیر نہیں ہو سکتا، اسی طرح "ارادہ الٰہی" کے بغیر بھی ممکن نہیں۔ تقدیر کی بھی یہی حقیقت ہے۔ چاہے کوئی شخص اپنی اصطلاح میں اسے تقدیر کا نام دے یا نہ دے، لہٰذا پھر تقدیر کی تفسیر بدلنے سے اشکال کہاں دور ہوا؟ اشکال تو پھر بھی برقرار ہے۔

### اشکال:

اگر پیش آنے والے تمام واقعات کا تعلق "ارادہ الٰہی" کے ساتھ ہے، تو "ارادہ الٰہی" کے خلاف ہونا تو محال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان مجبور محض اور بے اختیار ہے، اور اسے کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں؟

### جواب:

اس کے دو جواب ہیں: ایک الزامی، ایک تحقیقی۔

### الزامی جواب:

اگر اللہ تعالیٰ کے ارادے کے ساتھ، بندے کے کام متعلق ہونے سے، بندے کے

اختیار کی نفی لازم آتی ہے، تو چونکہ خود اللہ تعالی کے کام بھی اللہ تعالی کے ارادے سے ہوتے ہیں، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالی کا بھی اپنے کاموں پر اختیار باقی نہ رہے، حالانکہ کوئی عاقل بھی اس کا قائل نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوا کہ ارادہ الٰہی کے خلاف محال ہونے سے اختیار کی نفی لازم نہیں آتی۔

## تحقیقی جواب:

اللہ تعالٰی کا ارادہ بندوں کے افعال کے ساتھ، اس شرط کے ساتھ متعلق ہے کہ "بندے کا فعل خود بندے کے اختیار سے ہوگا"۔ یعنی انسان اللہ تعالٰی کے دیے ہوئے اختیار کے ساتھ اپنا کام سرانجام دیتا ہے، اور جب اس کے ساتھ ارادہ الٰہی شامل ہوتا ہے، تب اس کا کام ہوجاتا ہے۔ گویا فعل کا تعلق پہلے انسان کے اپنے اختیار سے ہے، پھر اللہ تعالٰی کے ارادے سے ہے۔ اس سے تو بندوں کا اپنے افعال پر اختیار اور مضبوط ہوگیا نہ کہ ختم ہوا۔

## سوال:

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو جو لوگ مسئلہ تقدیر کے قائل ہوتے ہیں، وہ نکمے اور سست رہتے ہیں، اور یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ جب ہونا وہی ہے، جو تقدیر میں لکھا ہے، تو کام کی کیا ضرورت ہے؟

## جواب:

1) یہ ان کی اپنی سستی کا اثر ہے نہ کہ مسئلہ تقدیر کا۔ اگر اس مسئلے کے یہ اثرات مرتب ہونا ہوتے تو نعوذ باللہ! صحابہ کرام سب سے زیادہ کم ہمت ہوتے۔

جبکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقدیر کو ماننے کا اثر تو یہ ہے کہ اگر ظاہری اسباب اور تدبیر کمزور ہو تب بھی کام شروع کردیا جائے، جیسا کہ صحابہ کرام کی نظر جب اللہ تعالٰی پر تھی تو بے سروسامانی کے باوجود کیسے جان لیوا خطرات میں بہادری کے ساتھ کود پڑے، یہی مفہوم ہے اس آیت کریمہ کا: "كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ" کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں، اللہ تعالی کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔

2) شریعت نے بھی ظاہری اسباب اور تدبیر کے چھوڑ دینے کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

چنانچہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ ہار گیا تو اس نے مایوس ہو کر کہا: "حَسْبِيَ اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" مجھے اللہ تعالی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کم ہمتی پر ملامت فرماتے ہیں، تمھیں سمجھداری سے کام لینا چاہیے (معاملے کا ثبوت رکھنا چاہیے) ہاں! جب ساری تدابیر اختیار کرنے کے باوجود مغلوب ہو جاؤ، تب کہو: "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" (سنن ابی داؤد: 3627) گویا آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سمجھا دیا کہ تدبیر چھوڑ دینا اور کم ہمتی اختیار کرنا کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔

## عقیدہ تقدیر کا فائدہ:

عقیدہ تقدیر ماننے کا یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان اسباب تو اختیار کرتا ہے، لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں، بلکہ مسبب الاسباب پر کرتا ہے۔ محنت تو کرتا ہے، لیکن نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اعتماد بھی اسی پر کرتا ہے۔ گویا ایسا شخص تدبیر کو اتنا درجہ دیتا ہے جتنا ریل گاڑی کے لیے "جھنڈی کا درجہ" کہ نہ تو معطل اور بے کار اور نہ ہی مؤثر حقیقی۔ ریلوے گارڈ کسی خطرے کے وقت جب ریل گاڑی کو روکنا چاہے، تدبیر تو یہی کرتا ہے کہ جھنڈی دکھاتا ہے، مگر نظر اس کی ڈرائیور پر ہوتی ہے، اور وہ بزبان حال یوں مترنم ہوتا ہے:

کار زلف تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

ترجمہ: "(اے محبوبہ!) مشک کی خوشبو پھیلانا تو تیری زلف کا کام ہے، اگرچہ عاشقوں نے یہ تہمت کسی حکمت کے تحت چین کے ہرن کے سر باندھ دی۔"

## عقیدہ تقدیر میں بحث ومباحثہ کرنے سے کیوں روکا گیا؟

اس مسئلے میں غور وفکر اور بحث ومباحثہ سے ممانعت اس لیے فرمائی گئی کہ، بعض شبہات "عقلی نہیں، بلکہ طبعی ہوتے ہیں" جن کے سمجھنے کے لیے دلیل کافی نہیں ہوتی، بلکہ فطرت سلیم کی ضرورت ہوتی ہے، چونکہ فطرت سلیم والے لوگ ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، تقدیر جیسے نازک مسئلے میں بحث ومباحثہ اور غور وفکر کرنے سے ایسے شبہات کے بڑھنے کا خطرہ ہے، جو دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے نقصان دہ ہوں۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شفقت اور حکمت کے پیش نظر تقدیر میں بحث ومباحثہ کرنے سے منع فرما دیا۔ جیسے کوئی مہربان ڈاکٹر کمزور مریض کو زیادہ طاقتور غذا استعمال کرنے سے روک دیتا ہے۔

# بارھواں انتباہ: ارکان اسلام سے متعلق غلط فہمیاں

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا، اور اس عبادت کی بجا آوری کے لیے ارکانِ اسلام اور بے شمار احکام عطا فرمائے۔ بعض اوقات انسان احکام شریعت کو حکم الٰہی سمجھ کر، اس پر عمل کرنے کے بجائے، اپنی ناقص عقل کو معیار بنا کے احکامِ شریعت کے اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے، جس سے اس کے عقائد اور اعمال دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ذیل میں اسی خطرناک غلطی پر متنبہ کیا جا رہا ہے۔

## غلطی: احکامِ شریعت کو غیر مقصود اور فضول سمجھنا

بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ احکامِ اسلام کو بذاتِ خود مقصود نہیں سمجھتے، بلکہ ہر حکم کی اپنی عقل سے ایک حکمت تلاش کر لیتے ہیں اور انہیں حکمتوں کو ہی مقصود سمجھتے ہیں۔ جب یہ حکمتیں انہیں ان احکام کے علاوہ دوسرے طریقوں سے حاصل ہونے لگتی ہیں، تو پھر ان احکام شریعت کی ضرورت سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

مثلاً: نماز میں تہذیبِ اخلاق کو...... وضو میں صاف ستھرا رہنے کو...... روزے میں حیوانی قوت اعتدال پر لانے کو...... زکوٰۃ میں غریب لوگوں کی امداد کرنے کو...... حج میں سوشل اجتماع، قوم کی بہبود، ترقی اور تجارت کے فروغ دینے کو...... اور تلاوتِ قرآن میں صرف معانی ومطالب سمجھنے کو...... دعا میں صرف دل کی تسلی کو...... اور جہاد میں صرف ”قیام امن وآزادی“ کو مصلحت قرار دے کر جب ان مصلحتوں کی ضرورت نہ رہی یا وہ مصلحتیں دوسرے ذرائع سے حاصل ہو گئیں تو احکام شریعت کو فضول قرار دے دیا اور جب اتنی جرات کر لی تو پھر مصلحتوں کے حصول کا انتظار بھی نہ رہا، احکام کو بالکل ہی چھوڑ دیا۔

### تردید:

اس غلطی کا رد انتباہ سوم (متعلق نبوت) غلطی چھ کے ضمن میں کیا جا چکا۔ حسبِ ضرورت دوبارہ اعادہ کیا جاتا ہے۔

## احکامِ شریعت کی من گھڑت حکمتیں تراشنے کی خرابیاں:

### 1) احکامِ شریعت میں تبدیلی

اپنی عقل سے احکامِ شریعت کی مصلحتیں نکالنے سے یہ خرابی پیش آئی کہ احکامِ شریعت میں تصرف کرکے احکام کو ہی بدلنے لگے۔ جیسا کہ آج کل قربانی کے بارے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد تو راہِ الٰہی میں خرچ کرنا تھا، اس وقت مویشیوں کی کثرت تھی اور خرچ کرنے کی یہی صورت تھی، اب پیسوں کا زمانہ ہے، لہٰذا اب عبادت کی صورت بدل دینی چاہیے۔ جانوروں کی قربانی کرنے کے بجائے، پیسوں کی صورت میں غریبوں کی امداد کرنی چاہیے۔

### 2) ہر جگہ حکمت نکل بھی نہیں سکتی

ان غلطیوں سے یہ سوال جنم لیتا ہے کہ آخر احکامِ شریعت میں کہاں تک حکمتیں نکالی جائیں گی؟ کیا کوئی شخص رکعتوں کی تعداد کی حکمت بتا سکتا ہے؟ اگر عقل ان امور کے لیے کافی ہوتی تو پھر انبیاء کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ہر زمانے میں دنیا میں بہت سے عقلمند اور حکیم لوگ موجود رہے ہیں۔

### 3) مقصودیت آخرت سے انکار

اگر غور کیا جائے تو درحقیقت ایسی مصلحتیں نکالنا جو سراسر دنیاوی فائدے پر مشتمل ہوں، درپردہ آخرت کے مقصود ہونے سے انکار کرنا ہے۔

### 4) آخرت کے خواص کو دنیا پر قیاس کرنا

اگر آخرت نام کی کوئی چیز ہے اور اس نے کبھی واقع ہونا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرا جہان ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ اس عالم کی خاصیتیں، یہاں کی خاصیتوں سے مختلف ہوں اور وہ خاصیتیں ہمیں معلوم نہ ہوں، جبکہ ان کا حاصل ہونا ان اعمال پر موقوف ہو اور ان اعمال اور اُن خاصیتوں کے درمیان خاص تعلق ہو جن سے ہم واقف نہ ہوں۔

### 5) حکمِ حاکم کی خلاف ورزی

فرض کیجیے کہ اگر کوئی شخص ملکی قوانین کے ساتھ یہی طرز اختیار کرے کہ ہر قانون کی کوئی

مصلحت نکال لے پھر اس مصلحت کو دوسرے آسان طریقے سے حاصل کرکے اصل قانون پر عمل کرنے سے انکار کردے تو ہر کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ حکومت اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟

عام سی بات ہے اگر عدالت کسی شخص کو عدالت میں حاضر ہوکر گواہی دینے کا آرڈر جاری کرے اور وہ شخص یہ کہہ کر مقرر تاریخ پر حاضر نہ ہو کہ: "مقصود تو میری گواہی، ہی ہے، تو میں لکھ کر ڈاک سے بھیج دیتا ہوں"۔ چنانچہ اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے وہ مکمل گواہی لکھ کر دستخط کرکے ڈاک کے ذریعے بھیج بھی دے اور خود حاضر نہ ہو، تو کیا ایسا کرنے والا عدالتی نوٹس کے مطابق قانونی سزا اور وارنٹ گرفتاری سے بچ سکتا ہے؟

**اشکال:** کیا احکام شریعت حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی ہیں یا یہ کہ فقہائے امت کو ان حکمتوں کا بالکل علم نہیں ہوسکا؟

**جواب:** احکام شریعت میں بہت ساری حکمتیں ہیں، اور کچھ حکمتوں پر فقہاء مطلع بھی ہوئے ہیں، لیکن احکامِ شریعت پر عمل کرنے کا دارومدار ان حکمتوں اور مصلحتوں کے جاننے پر نہیں ہے۔ اگر ان حکمتوں کا علم نہ ہو تب بھی احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔

یہ بالکل ملکی قوانین جیسی صورتحال ہے کہ عوام کو حکومتی حکم کی وجہ جاننے تک حکم کی تعمیل سے انکار کرنا جرمِ عظیم ہے۔ ان قوانین کی وضاحت میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، ریاست کا احسان ہے، اور قوانین کے اثرات سے جس قدر مطلع کیا جاتا ہے، وہ بھی محض ظنی ہوتے ہیں۔ بعض قوانین ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی حکمتیں بالکل نہیں بتائی جاتیں، اور اس پر کسی کو حیرت بھی نہیں ہوتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گھر کے ملازم کو بعض گھریلو انتظامات کی وجہ معلوم نہیں ہوتی، حالانکہ وہ ملازم بھی گھر کے مالک کی طرح مخلوق ہے۔ جب مخلوق کو مخلوق کے بعض راز معلوم نہیں ہوتے، حالانکہ دونوں کا علم ایک ہی طرح محدود ہے، تو اگر مخلوق کو خالق کے رازوں کا بالکل علم نہ ہو یا درست اور صحیح پتہ نہ ہو، تو اس پر تعجب کی کیا بات ہے، جبکہ دونوں کے علم میں بے انتہا فرق ہے۔

بلکہ ایک عقل مند کے بقول اگر تمام احکامِ شریعت کی حکمتیں مکمل طور پر مخلوق کو معلوم ہوجائیں تو لوگ شک میں مبتلا ہوجائیں گے اور اسلام کے متعلق شبہ کرنے لگیں گے کہ اس دین کو کسی عقلمند شخص یا جماعت نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ کیونکہ خدائی مذہب کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ انسانی عقل اس کی حکمتوں اور رازوں سے عاجز ہو۔

اس وضاحت سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ جن احکام کی حکمتیں عقلی طور پر سمجھ میں نہیں آتیں وہ خلافِ عقل ہیں۔ ہرگز نہیں۔ عقل کے خلاف ہونا اور بات ہے، عقل میں نہ آنا اور بات ہے۔

# تیرہواں انتباہ: معاملات اور سیاست سے متعلق غلط فہمیاں

انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ، خواہ وہ عبادات ہوں یا معاملات، سیاست ہو یا معیشت، شریعت کی راہنمائی سے خالی نہیں۔ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جو انسان کو نہ صرف انفرادی پاکیزگی سکھاتا ہے، بلکہ اجتماعی معاملات میں بھی راہنمائی دیتا ہے۔ مگر افسوس! آج بعض ذہنوں میں یہ خطرناک غلطی رچ بس گئی ہے کہ دین محض عبادات تک محدود ہے، معاملات اور سیاست سے دین کا کوئی تعلق نہیں۔

## غلطی: معاملات اور سیاست کو جزو شریعت نہ سمجھنا

چنانچہ ایک بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ معاملات یعنی لین دین، تجارت، نوکری، اور سیاسیات یعنی انتظامی اور حکومتی کاموں کو دین کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ متجددین کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں صرف دنیاوی ہیں، ان کا دارومدار دین پر نہیں، بلکہ زمانے کی مصلحت اور لوگوں کی رائے پر ہے، لوگ ان میں مکمل بااختیار ہیں۔ اسی وجہ سے سود جیسے حرام کام کو بھی حلال کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ بلکہ علماء کو بھی مشورے دیتے ہیں اور ان کے قبول نہ کرنے پر غصہ ہوتے ہیں اور انہیں ترقی کا دشمن سمجھتے ہیں۔

**جواب:** سب سے پہلے یہ تحقیق کرلی جائے کہ شریعت میں کسی چیز کے داخل ہونے یا نہ ہونے کا معیار کیا ہے؟ تاکہ اس معیار کے مطابق اس بات کا فیصلہ با آسانی ہوسکے کہ کون سی چیز شریعت میں داخل اور دین کا جزو ہے اور کس بات کا تعلق دین سے نہیں ہے۔ چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے لیے شریعت میں داخل ہونے اور دین کا جزو بننے کا معیار یہ ہے کہ "اس شے سے متعلق شریعت کی طرف سے ثواب کا وعدہ یا عذاب کی وعید ہو"۔

آپ قرآن وحدیث میں غور کریں تو جابجا معاملات اور سیاسیات وانتظامی امور کے بارے میں ہدایات، ثواب کے وعدے اور عذاب کی وعیدیں نظر آئیں گی، لہذا جب یہ چیزیں معیار کے تحت آگئیں تو اب ان کے شریعت کا جزو اور حصہ ہونے میں کیا شبہ باقی رہا؟

**سوال:** مجتہدین جو مسائل اپنے اجتہاد سے مستنبط کرتے ہیں، کیا وہ مسائل بھی دین کا حصہ ہیں؟

**جواب:** اجتہاد یا قیاس شرعی کے ذریعے مستنبط کردہ مسائل بھی دین کا حصہ اور جزو ہیں، کیونکہ

قیاس شرعی کے ذریعے مسائل کا مخفی اور پوشیدہ حکم صرف معلوم کیا جاتا ہے، اپنی طرف سے لگایا نہیں جاتا۔ اصل مسائل خود نص سے ثابت ہوتے ہیں۔

**شبہ:** بعض لوگ کہتے ہیں کہ شریعت کے کچھ احکام ہماری موجودہ زندگی کے لیے نقصان دہ ہیں، ان پر عمل کرنے کی وجہ سے تنگی پیش آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو حقیقت میں وہ احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں یا وہ صرف پرانے زمانے کے لیے تھے۔ آج کے زمانے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے؟

**جواب:** احکام شریعت پر عمل کی وجہ سے تنگی پیش آنے کا سبب "شریعت" نہیں، بلکہ خود ہمارا "غلط طرز معاشرت" ہے۔ اس لیے کہ اکثر لوگ شریعت پر عمل نہیں کر رہے ہے، تو جب بعض لوگ عمل کریں گے اور انہیں ایسی اکثریت سے واسطہ پڑے گا، تو انہیں تنگی محسوس ہوگی، اس تنگی کی وجہ اکثریت کی شریعت سے دوری ہے نہ کہ خود شریعت کے احکام۔

اگر بظاہر کہیں ذاتی نقصان نظر آئے بھی تو وہ اجتماعی عوامی فائدے کی خاطر ہوتا ہے، اور ایسا تو ہر قانون میں ہوتا ہے۔

## آج کل لوگوں کا طریقہ:

بعض لوگ جو اسلام کے خیر خواہ بنے پھرتے ہیں، وہ حکم شریعت پر اعتراض سن کر معترض سے دلیل مانگنے کے بجائے فوراً شریعت کا حکم بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن کی اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں: وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑتے ہیں۔

## خرابی کی اصل جڑ اور بنیاد:

خرابی کی اصل جڑ اور بنیاد دنیا کی محبت اور اہل دنیا کی خوشامد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ احکام بدلتے ہیں، اگر وہی لوگ اسلامی اصولوں کو مان لیں تو یہ فوراً اپنا پرانا اعتراض چھوڑ کر شریعت کو ماننے لگیں گے۔ کیونکہ ان لوگوں کی توجہ کا قبلہ دنیا داروں کی خوشی اور رضا ہے۔ جہاں ان کی خوشی ہوگی، یہ ادھر ہی پھر جائیں گے، جیسے جہاز میں نماز پڑھنے والا جہاز کے گھومنے سے خود بھی گھوم جاتا ہے۔

# چودہواں انتباہ: معاشرت سے متعلق غلط فہمیاں

اسلام ایک مکمل دین ہے۔اس کی روشنی صرف مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں، بلکہ یہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو منظم اور پاکیزہ بناتا ہے۔

لیکن زمانۂ جدید کے کچھ لوگ، جو اپنی عقل کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرتی آداب، رہن سہن، لباس، طرزِ خوراک، نشست و برخاست وغیرہ انسان کی ذاتی پسند پر منحصر ہیں اور ان کا شریعت سے کوئی واسطہ نہیں۔

اسی غلط نظریے کو یہاں بیان کر کے اس کا جواب پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ شریعت کی روشنی میں انسان کا کوئی گوشۂ زندگی اس کی اپنی مرضی کا غلام نہیں، بلکہ اللہ کی مرضی کا پابند ہے۔

## غلطی: معاشرتی امور کو شریعت کا جزو نہ سمجھنا

متجددین کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرتی ضابطوں، لباس کے آداب، رہن سہن کے طریقوں اور روزمرہ عادات کا دارومدار انسان کی اپنی ذاتی آسائش، آرائش اور پسند پر منحصر ہے، ہر شخص کو پورا حق ہے کہ جس طرح چاہے، اپنی مرضی سے ان امور کو اختیار کرے یا چھوڑ دے، دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

**جواب:** یہ سوچ دراصل دین کو ناقص سمجھنے کا دوسرا نام ہے، جبکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو نہ صرف مسجد بلکہ بازار، گھر، مجلس، لباس، خوراک، نشست و برخاست ہر گوشۂ زندگی کو آدابِ شریعت سے منور کرتا ہے۔

سب سے پہلے یہ اصول ذہن نشین رہے کہ جن کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں شریعت نے وعدے یا وعیدیں ارشاد فرمائیں، وہ دین کا جزو اور حصہ ہیں۔ چاہے وہ عبادات ہوں، اخلاقیات ہوں یا معاشرتی آداب۔ قرآن و حدیث میں ان سب چیزوں کے بارے میں وعدے اور وعیدیں موجود ہیں، لہذا یہ سب چیزیں دین کا حصہ ہیں۔ البتہ جن امور کے متعلق شریعت نے کوئی خاص حکم یا اصولی اور کلی حکم ارشاد نہیں فرمایا، ان میں بے شک

اختیار ہے، جس طرح چاہیں انہیں سرانجام دیں۔ لیکن جن امور سے متعلق کوئی خاص حکم یا اصولی اور کلی حکم قرآن وحدیث میں موجود ہے، ان میں ہرگز کسی کو اختیار نہیں۔

## بعض خاص احکام:

مثلاً: مردوں کے لئے ریشم کا استعمال...... مردوں کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا یعنی شلوار، چادر وغیرہ لٹکانا...... داڑھی منڈوانا یا ایک مٹھی سے کم کردینا...... جاندار چیزوں کی تصویریں بنوانا یا رکھنا...... بغیر ضرورت کے کتا پالنا...... غیر شرعی طریقے سے ذبح شدہ جانور کھانا...... شراب کا کسی بھی طریقہ سے استعمال کرنا...... یہ سب حرام اور ناجائز امور ہیں۔

## بعض اصولی احکام:

مثلاً: کفار کے ساتھ مشابہت چاہے لباس میں ہو یا کھانے پینے کے طور طریقوں میں...... بغیر رضامندی یا دھوکہ سے کسی سے کوئی چیز لینا...... تکبر اور فخر کے طور پر لباس یا سواری کا استعمال کرنا وغیرہ...... ان چیزوں کا حکم چونکہ قرآن وحدیث میں واضح طور پر موجود ہے، اس لیے ان میں کسی شخص کو اختیار نہیں، بلکہ احکام شریعت کی پابندی ضروری ہے۔

## آزاد خیال لوگوں کا طرز عمل:

آزاد خیال اور روشن خیال لوگوں نے ان امور کے متعلق ایک خاص مزاج اپنا رکھا ہے...... کبھی تو ان امور کے متعلق قرآن کریم کی صریح آیت کا مطالبہ کرتے ہیں اور احادیث میں شبہات نکالتے ہیں کہ یہ محفوظ نہیں ہیں...... کبھی اپنی طرف سے ان احکام کی علتیں نکال کر احکام میں ردوبدل کی کوششیں کرتے ہیں...... کبھی ان احکام کی عقلی وجوہات کا مطالبہ کرتے ہیں...... تو کبھی ان احکام کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

## جواب:

ان تمام شبہات کے جوابات سابقہ انتباہات میں عرض کیے جاچکے ہیں، مزید ایک

جواب یہاں بھی عرض کیا جارہا ہے کہ:

احکام شریعت قوانین خداوندی ہیں۔قانون کے سامنے کسی کی رائے نہیں چلتی اور نہ قانون کی حکمت اور وجہ پوچھنے کی اجازت ہوتی ہے،اور اگر کبھی کوئی حکمت یا مصلحت بات سمجھانے کے لیے بتادی جائے تو یہ محض احسان ہے۔اصل چیز تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔جو شخص حکمت کو ہی اصل سمجھے وہ دراصل قانون کی روح سے ناواقف ہے اور یہ اس کی فطرت کی خرابی کی علامت ہے۔

ذرا سوچیے! کیا اپنی بیوی کا لباس پہن کر محفل میں چلے جانے کو صرف مشابہت کی وجہ سے معیوب نہیں سمجھا جاتا؟ کیا دنیا کی کمپنیاں اور ادارے اپنے کارکنوں کے لیے مخصوص یونیفارم مقرر نہیں کرتے؟ اور کیا اس کی خلاف ورزی کو برداشت کیا جاتا ہے؟ تو کیا خالقِ کائنات کو اتنا اختیار بھی نہیں کہ وہ اپنے بندوں کے لیے لباس، وضع قطع اور زندگی گزارنے کے طریقے مقرر فرمائے؟

## پندرہواں انتباہ: باطنی اخلاق سے متعلق غلط فہمیاں

اسلام ایک ایسا مکمل اور جامع دین ہے جس نے انسان کی ظاہری زندگی ہی نہیں، بلکہ اس کے باطن، دل، نیت اور جذبات تک کو اپنی تعلیمات کا حصہ بنایا۔عبادات، صحیح معاملات، معاشرت اور سیاست کی طرح دل کی کیفیت اور اخلاقِ باطنی بھی دین کی اصل روح ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آج لوگ اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ دین صرف نماز، روزہ اور زکوۃ تک محدود ہے، حالانکہ اگر اخلاق باطنی درست نہ ہوں تو یہی عبادات بے جان جسم کی مانند ہیں۔اس غفلت نے آج امت میں ایسا اخلاقی بگاڑ پیدا کردیا ہے، کہ اچھے لباس، میٹھی زبان اور خوبصورت نعروں کے باوجود دل زنگ آلود اور خراب ہو چکے ہیں۔چنانچہ باطنی امور سے متعلق چند غلطیوں کو یہاں بیان کر کے اس کا جواب پیش کیا جارہا ہے۔

## پہلی غلطی: اخلاقِ باطنی اور جذباتِ نفسانیہ کو دین کا حصہ نہ سمجھنا

سب سے پہلی غلطی یہ ہے کہ باطنی اخلاق اور نفس کی کیفیات کو دین سے خارج سمجھا جاتا ہے، حالانکہ قرآن وحدیث میں دل کی پاکیزگی، نیت کے خلوص اور تہذیب نفس کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں دین کا حصہ ہیں۔

## دوسری غلطی: اچھے اور برے اخلاق میں خلط ملط

دوسری بنیادی غلطی یہ ہے کہ اچھے اور برے اخلاق کو آپس میں خلط ملط کردیا گیا ہے۔ بعض برے اخلاق کو خوش نما نام دے کر اچھا ظاہر کیا گیا ہے، جبکہ بعض اچھے اخلاق کو برا نام دے کر بدنام کردیا گیا۔

### پہلی قسم:

وہ اخلاق جنہیں اچھا سمجھا جاتا ہے، جبکہ حقیقت میں وہ برے ہیں:

مال وجاہ کی ہوس اور شان وشوکت کی طلب کو آج "ترقی" کا نام دے دیا گیا ہے ......تکبر وغرور کو شرافت اور عزت کا لقب دے دیا گیا ہے......اندھی عصبیت اور حق وباطل کی تمیز کے بغیر تعصب کو "قومی ہمدردی" کہا جاتا ہے......دھوکہ، فریب اور تلبیس کو حکمتِ عملی اور سیاسی بصیرت کے خوبصورت عنوان سے پکارا جاتا ہے......اصولوں کی قربانی اور منافقت کو "رفتارِ زمانہ کی موافقت" اور حالات کے مطابق چلنا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب برے اخلاق ہیں، قرآن وحدیث میں ان کی مذمت کی گئی، ان سے بچنا ضروری ہے۔

### دوسری قسم:

وہ اخلاق جنہیں برا کہا جاتا ہے، جبکہ حقیقت میں وہ اچھے ہیں:

قناعت یعنی جتنا اللہ نے دیا ہے، اس پر راضی رہنے کو "کم ہمتی اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ" سمجھا جاتا ہے......توکل یعنی اللہ پر بھروسہ اور اُمور کو اُس کے سپرد کرنے کا نام "تعطل، سستی اور کام چوری" رکھ دیا گیا......دینی غیرت وحمیت کو "انتہا پسندی اور شدت پسندی" کہا جاتا ہے......سادہ طرزِ زندگی کو بدتہذیبی اور ذلت" سمجھا جاتا ہے......انکساری اور عاجزی کو "کمزوری

اور پست طبیعت“ کہہ کر حقیر جانا جاتا ہے......تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنے کو”وسوسہ اور وہم“ کہا جاتا ہے......فضول اور بے کار محفلوں سے بچنے کو”وحشت“ سمجھا جاتا ہے۔

حقیقت میں یہ سب اچھے اخلاق ہیں، قرآن وحدیث میں ان کی تعریف کی گئی ہے، انہیں اپنانا چاہیے۔

### وہ برے اخلاق جنہیں نام بدلے بغیر اپنا لیا گیا

کچھ برے اخلاق ایسے ہیں جن کا نام تبدیل نہیں کیا گیا، لیکن ان کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی پرواہ نہیں، مثلاً: بدگمانی......ظلم اور غریبوں کی حق تلفی......مسکینوں کے ساتھ برا سلوک......دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھنا......بے ادبی......اہلِ علم کی غیبت اور عیب جوئی......ریا کاری، دکھاوا اور غرور......فضول خرچی اور اسراف......آخرت سے غفلت اور لا پرواہی۔

یہ سب برے اخلاق ہیں، ان سے متعلق قرآن وحدیث میں وعیدیں موجود ہیں، ان کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

ان تمام حقائق کی بہترین تشریح امام غزالیؒ کی مشہور کتاب”احیاء علوم الدین“ وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہے۔ ان کتب کا مطالعہ دل ودماغ کی بیماریوں کا بہترین علاج ہے۔

## سولہواں انتباہ: استدلال عقلی سے متعلق غلط فہمیاں

عقل اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، مگر جب یہی عقل وحی کی تابع رہنے کے بجائے اس پر حکم لگانے لگے تو گمراہی کا راستہ کھل جاتا ہے۔ آج کل کا زمانہ عقل پرستی کا شکار ہے۔ ہر بات میں عقلی استدلال کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری انتباہ میں منطقی طور پر چند اہم غلطیوں کی نشاندہی فرمائی:

1) پہلی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ دلیل عقلی کو مطلقاً دلیل نقلی پر ترجیح دی جاتی ہے، حالانکہ اس میں تفصیل ہے، جسے ساتویں اصول میں تفصیلاً ذکر کیا جا چکا۔

2) دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اندازے واستقرا کو دلیل عقلی قطعی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ استقرا میں چند جزئیات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ان جزئیات سے دوسری جزئیات پر استدلال کرنا قطعی نہیں ہوسکتا۔

3) تیسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ منقول محض یعنی شریعت کے احکام کو عقل سے لازمی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

4) چوتھی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ نظیر اور دلیل کو ایک سمجھا جاتا ہے، جبکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔(تفصیل کے لیے چھٹا اصول ملاحظہ کیجیے)۔

5) پانچویں غلطی یہ کی جاتی ہے کہ جن امور کا وقوع پذیر ہونا عقلاً ممکن ہو، ان پر دلیل عقلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہر چیز کے لیے عقلی دلیل کا مطالبہ کرنا درست نہیں ۔(ملاحظہ کیجیے پانچواں اور چھٹا اصول)۔

6) چھٹی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ مستبعد یعنی حیران کن اور عجیب چیز کو محال سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مستبعد اور محال دونوں الگ الگ ہیں۔ان دونوں کو ایک سمجھنا درست نہیں۔ (دیکھیے اصول نمبر تین)۔

7) ساتویں غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اہل سائنس نے خلاف عادت کا نام خلاف عقل رکھا ہے۔ جو چیز عادت کے خلاف ہوتی ہے، اسے خلاف عقل کہتے ہیں۔ حالانکہ خلاف عادت اور خلاف عقل میں بہت بڑا فرق ہے۔(دیکھیے اصول نمبر تین)۔

**تمّت بالخیر**

**عامر شعیب ڈیروی**
جامعہ فاروقیہ شجاع آباد